# نگار

قیمت فی کاپی عار

# تصانیف نیاز فتحپوری

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی
انجیل انسانیت

## من ویزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کرکے تمام نوع انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامّہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، وحی، عقائد رسالت کے مفہوم اور صحایف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا، اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۷۰۰ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے
(معہ) علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات
یعنی

## من ویزداں کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے انکی مختصر فہرست یہ ہے:۔ اصحاب کہف۔ معجزہ و کرامت۔ انسان مجبور ہے یا مختار۔ مذہب و عقل۔ طوفان نوح۔ خضر کی حقیقت۔ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں۔ یونس اور ماہی۔ حسن یوسف کی داستان۔ قارون۔ سامری۔ علم غیب۔ دعا و توبہ۔ لقمان۔ عالم برزخ۔ یاجوج ماجوج۔ ہاروت ماروت۔ حوض کوثر۔ امام مہدی۔ نور محمدی اور پل صراط۔ آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۴۴۴ صفحات۔ کاغذ سفید دبیز
قیمت علاوہ محصول پانچروپیہ آٹھ آنے

### نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں نقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے و ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے، اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

### جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جسمیں حسن بیان، ندرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسایل کا حل بھی آپکو نظر آئے گا۔ ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

### حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپکو نظر آئیگا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ ہیں جنہیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے۔
قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

### ترغیبات جنسی یا

شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کیساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے جسمیں بتایا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی۔ اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا اڈیشن
قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ "نگار" ۱۹۵۱ء

# ایک مستقبل کی تلاش میں

# انتساب

دُنیا کے تمام کاشتکاروں، مزدوروں اور
جماعتِ اسلامی کے ہر ہر فرد کے نام

---

شیر شو، شیرانہ در صحرائے شیراں پائے نہ
مرد شو، مردانہ پندِ ناصحاں را گوش گیر

نیاز

## ایک مستقبل کی تلاش میں (مارس ہنڈس)

مترجم ۔ لطیف الدین احمد اکبرآبادی

## جنگ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

نیاز فتحپوری

---

## اظہار تشکر

میں جناب لطیف اکبرآبادی کا حد درجہ ممنون ہوں کہ انھوں نے مارس ہنڈس کی کتاب کے ترجمہ و تلخیص کا بار اپنے سر لیکر سالنامہ کی طیاری میں میری بڑی مدد فرمائی

نیاز

# ایک مستقبل کی تلاش میں

حال ہی میں ایک یوروپین سیاح مارس ہنڈس (Maurus Hindus) کی کتاب شایع ہوئی ہے، جس کا نام ہے "In search of a future" یہ کتاب نتیجہ ہے ایران، مصر، عراق اور فلسطین کی سیاحت کا جو اس نے صرف اس غرض سے کی تھی کہ وہاں کے حالات کا مطالعہ کرکے ان ملکوں کے مستقبل کے متعلق خود کوئی رائے قایم کرسکے۔ اس نے سیاحت کے لئے اس سرزمین کو اس لئے پسند کیا کہ مشرق وسطیٰ کے مسایل سے روس و امریکہ کو جو گہرا تعلق حاصل ہے، اس کے اسباب و نتایج کو اچھی طرح سمجھ سکنے کے لئے خود وہاں جانا ضروری تھا اس نے ایران میں کافی وقت صرف کیا کیونکہ یہی وہ ملک ہے جو روس و امریکہ کے درمیان عرصہ سے "استخوانِ جنگ" بنا ہوا ہے اور جس کا وزن یہاں کی سیاسی ترازو کے پلّہ کو جس طرف چاہے جھکا سکتا ہے، اس نے گاؤں گاؤں جاکر یہاں کی اقتصادی و معاشی حالات کا مطالعہ کیا، اس نے ہر طبقہ کے لوگوں سے ملکر ان کے رجحانات کا پتہ چلایا اور وہ یہاں کی آبادی کے افلاس، ملک کی تباہ حالی اور حکومت کی بدنظمی سے اس قدر متاثر ہوا کہ بجائے اس کے کہ وہ یہاں کی سیاسیات کا مطالعہ کرتا یہاں کے اقتصادی حالات پر آنسو بہانے لگا اور سوچنے لگا کہ اس خوبصورت، زرخیز، شاداب و شگفتہ سرزمین کو اس کے ہولناک مستقبل سے کیونکر بچایا جاسکتا ہے۔

انھیں تاثرات کو لئے ہوئے وہ ایران سے مصر گیا، اور مصر سے عراق و فلسطین پہونچا، لیکن بجائے اسکے کہ ان تاثرات میں کمی ہوتی، ان میں اور اضافہ ہوتا گیا، کیونکہ اس نے ان ملکوں کی حالت بھی ایسی ہی خراب پائی اور وہ آخرکار اس نتیجہ پر پہونچا کہ اگر مشرق وسطیٰ کی مسلم حکومتوں اور مسلمانوں کو دنیا میں باقی رہنا ہے تو انھیں فلسطین کی اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے جس نے صحرا اور ریگستان کو چند دنوں میں خدا جانے کیا سے کیا بنا دیا ہے چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "اگر فلسطین میں یہودی نہ ہوتے تو

مشرق وسطیٰ کی نجات کے لئے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ ان کو دیکھ کر مشرق وسطیٰ کے مسلمان سمجھ سکیں کہ محنت و کوشش اور صحیح و صالح تدابیر سے انسان کیا نہیں کر سکتا۔"

اس نے ایران، مصر اور عرب ہر جگہ عام آبادی اور خصوصیت کے ساتھ کاشتکاروں اور مزدوروں کے حالات کا مطالعہ کر کے افسوس کیا ہے کہ مصر میں جسے کرۂ زمین کا چمنستان کہنا چاہئے۔ تین چوتھائی دیہی آبادی پاؤں کی ایک خاص بیماری ( Bilharzias ) میں صرف اس لئے مبتلا نظر آتی ہے کہ وہ جوتا نہیں خرید سکتے۔ شام کے متعلق وہ کہتا ہے کہ "یہاں کی دو تہائی آبادی گاؤں میں رہتی ہے اور ۴/۵ حصہ زمین کا ان زمینداروں کے قبضہ میں ہے جنھوں نے جا کر کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ کاشتکاروں کی حالت کس قدر خراب ہے"۔

عراق میں جہاں قابل کاشت زمین کی کمی نہیں، صرف ۱/۵ حصہ کاشت کیا جاتا ہے اور وہ بھی نہایت تکلیف و مصیبت کے ساتھ۔ وہ کہتا ہے کہ "مشرق وسطیٰ کے کاشتکار طبقہ کا تصور گویا "فاقہ و موت" کا تصور کرنا ہے اور یہاں کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ دنیا میں اس کی نظیر نہیں ملتی، صاف پانی حاصل کرنے کے لئے بھی ان کے پاس پیسہ نہیں ہے، یہاں کے لوگ جانوروں کو بھی اپنے ہی جھونپڑوں میں رکھتے ہیں اور گندگی نے ان کی صحتوں کو بالکل تباہ کر رکھا ہے"۔

سیاح مذکور جب ان ملکوں کی سیاحت کر کے اسرائیلی حکومت میں پہونچتا ہے تو اس کی حیرت کی انتہا نہیں رہتی اور اس کو یقین نہیں آتا کہ کیا یہ بھی اسی سرزمین کا حصہ ہے، جسے وہ اس قدر بدحال دیکھ چکا ہے۔ چھ مہینے کی سیاحت کے بعد سب سے پہلے اُسے یہیں جرأت ہوئی کہ وہ ایک سلیقہ کی دوکان سے ناسپاتی لیکر کھا سکتا اور صاف پانی سے نہا سکتا۔

ہندٹس، یہ دیکھ کر حیران ہو گیا کہ اسرائیلی حکومت کیونکر چند دنوں میں صحرا و ریگستان کو باغ و بہار بنا سکی۔ اس نے دلدلی زمینوں کو جہاں کے مچھروں سے ملیریا پھیلتا تھا ختم کر دیا، آبپاشی کے ذرائع پیدا کر کے خشک ریتیلے میدانوں کو گلزار بنا دیا، ان حصوں کو جہاں کبھی غلہ کا ایک دانہ پیدا نہ ہوتا تھا، ہری بھری کھیتیوں میں تبدیل کر دیا اور ان مقامات میں جہاں لوگ پانی کے ایک ایک قطرہ کے لئے ترستے تھے نہریں بہا دیں۔ اور یہ سب اس لئے ہو سکا کہ انھوں نے سب سے پہلے کاشتکاروں کی اصلاح کی، کاشت کے نئے طریقوں سے انھیں آگاہ کیا، کاشتکاروں میں زندگی کا وہ احساس پیدا کیا جس سے وہ اسوقت تک بالکل بے خبر تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فلسطین کی بے آب و گیاہ زمین سونا اُگلنے لگی۔

سیاح مذکور کہتا ہے کہ ایران، مصر و عراق سب کو اسرائیلی حکومت سے سبق لینا چاہئے اور اگر

وہ زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے انھیں کاشتکار طبقہ کی اصلاح کرنا چاہئے۔

اس نے ایران میں تودہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس نے اپنے ایک سال کے دوران اقتدار میں آذربیجان کے اندر کافی اصلاح کرنا چاہی لیکن وہ معمولی سی طہرانی فوج کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ (حالانکہ کچھ زمانہ قبل اسی فوج کو کاشغائی علاقہ کے قبایل نے شکست فاش دیدی تھی) اس کا سبب صرف یہ تھا کہ تودہ تحریک کاشتکاروں کی اصلاح کی طرف متوجہ نہ ہوئی اور ان کی حمایت نہ حاصل کر سکی۔ لیکن یہ سمجھنا کہ کاشتکاروں کی یہ تقسیم حالت ہمیشہ ایسی ہی رہے گی غلط ہے، کیونکہ روس میں بھی کاشتکاروں کی بالکل یہی حالت تھی اور جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تو انھوں نے حکومت کا تختہ اُلٹ کر رکھدیا۔

سیاح مذکور لکھتا ہے کہ:- "ہمارے مدبرین یہ تو سوچتے رہتے ہیں کہ روس کے اقدامات اور اشتراکیت کی ریشہ دوانی کو کیونکر ختم کیا جائے، ایشیا و افریقہ کی انقلابی تحریکوں پر کس طرح قابو پایا جائے، نئی نئی زمینیں کھود کر معلوم کیا جائے کہ پٹرول کے چشمے کہاں کہاں ہیں، اور جدید مالیاتی منصوبے قایم کرکے نئی نئی منڈیاں پیدا کی جائیں۔ لیکن غریب فلاح و کاشتکار کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ انھیں سمجھنا چاہئے کہ اگر زمین کے مسئلہ کو طے نہ کیا گیا تو کاشتکار خود اسے طے کرے گا اور اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو روس میں ہوا اور اب چین میں ہمارے سامنے ہے یعنے اشتراکیت اور صرف اشتراکیت"۔

(نیاز)

---

**پیش لفظ** یہ کتاب ان ملکوں کے حالات پر ہے جو اپنا مستقبل پالینے کی جستجو میں ہیں، یعنے ایران، مصر، عراق و فلسطین وغیرہ۔ اس کتاب کا موضوع انھیں ملکوں کی آبادی اور سرزمین ہے، وہاں کے شہروں اور کلچر کا ذکر محض ضمنی طور پر آیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہودی فلسطین جس کا نیا نام اسرائیلی حکومت ہے ان قوموں کی ترقی کے لئے ایک عمدہ مثال بن سکتا ہے، بشرطیکہ وسطی مشرق کی مسلمان قومیں اپنے اپنے ملک کی طبعی حالات کے پیش نظر، اس دستور العمل سے فایدہ اٹھائیں جو اسرائیلیوں نے صحرا و بیابانوں کو سرسبز و زرخیز بنا کر پیش کیا ہے اور اگر انھوں نے ایسا نہ کیا تو انھیں ایک سخت خونیں انقلاب کا منتظر رہنا چاہئے، جس کا ریہرسل ایرانی آذربیجان میں بھی ہو چکا ہے۔

یہودی فلسطین آج سے ایک نسل پہلے تک اسی طرح خواب خرگوش میں مبتلا تھا جس طرح عرب فلسطین۔ لیکن اس مختصر مدت میں اسرائیلی فلسطین میں باوجودیکہ وہ بیرونی اور خصوصاً برطانوی اثرات کا ہدف بنا رہا، حیرتناک

ترقی کرلی ہے اور اس علاقے کی اندرونی ترقیوں کا نہایت مکمل دستور العمل بن چکا ہے، اس کے برخلاف مشرق وسطیٰ کے اسلامی ممالک جو ابھی تک بیرونی مداخلت سے محفوظ ہیں، اپنے مستقبل کی تعمیر کے لئے اندھیرے کو ٹٹول رہے ہیں۔

یہ تصنیف نہ تو سیاسی حجت وبحث ہے نہ تاریخی مقالہ۔ مجھے صیہونی یا عربی فلسفے سے بھی واسطہ نہیں ہے اس کتاب میں میرا واسطہ عربوں، ایرانیوں، مصریوں اور یہودیوں سے صرف انسانیت کا واسطہ ہے۔

فلسطین کا لفظ جن سیاسی اختلافات اور تاریخی موضوعات کی طرف اشارہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جو بین الاقوامی نزاعیں پیدا ہوسکتی ہیں، اس پر نہایت قابل لکھنے والوں نے قلم اٹھایا ہے۔ لیکن فلسطین کی رائل کمیشن نے ۳۷ء میں جو رپورٹ شایع کی ہے وہ اس مسئلہ پر نہایت واضح تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ Sumner Wells کی تصنیف We can not fail بھی ایک ایسی کتاب ہے جو اس موضوع پر جامع اور دستاویزی شہادت ہونے کے ساتھ ہی برطانوی ذمہ داریوں اور ناکامیوں، امریکن وعدوں اور بدعہدیوں پر کافی روشنی ڈالتی ہے۔

اسرائیلی حکومت کا مستقبل جو کچھ بھی ہو۔ لندن کا دفتر خارجہ اور امپیریل جنرل اسٹاف یہودیوں کے ساتھ جو سلوک چاہے کرے، مگر اس قوم کا یہ روشن کارنامہ کہ اس نے ریگستانوں کو سرسبز و شاداب باغوں میں بدل دیا ہے کبھی نہیں بھلایا جاسکتا۔ خوش قسمتی سے میں آنجہانی Zindel Vilkin سے متعارف تھا۔ ایک ملاقات کے دوران میں اس نے ایشیائی ملکوں کی پستی کے متعلق ایک نہایت اہم بات کہی کہ "ان کروروں کسانوں کے پاس اگر صرف اتنی زمین ہوتی کہ وہ سال میں ایک جوڑا کپڑوں کا، ایک جوڑا جوتہ، دو بنیان، دو قمیص اور دو موزے ہی خرید سکتے تو خیال کرو کہ ہم ان کے ساتھ کتنی بڑی تجارت کرسکتے تھے!"۔ ولکن خود پانچ زراعتی فارموں کا مالک تھا اس لئے کاشت اور اراضی کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اور اس کا یہ کہنا کہ افریقہ و ایشیا کی نہایت پست قوموں کے افلاس کی جڑ اراضی کی غلط تقسیم ہے، نادرست نہ تھا اور اس سے انکار ممکن نہیں کہ کروروں انسانوں کی زمین سے محرومی اور اسی کے ساتھ پرانے طریقوں اور آلات سے کاشتکاری کے اندر وہ طوفان بھی چھپا ہوا ہے جو جوالا مکھی کے دھوئیں کی طرح دنیا کے بہت بڑے حصے پر منڈلا رہا ہے اور اس وقت ایران، مصر، عراق اور ایشیا و افریقہ کے دوسرے ملک بھی اس طوفانِ عظیم کے منتظر ہیں ——— باوجود اس کے کہ اسرائیلیوں کی زرعی پالیسی اور ترقی، اس کی آبادی کی صحت مندی، کاشتکاروں کی پر امید زندگی بلاشبہ ایک مستحکم چٹان ہے مگر انکا اندرونی امن وسکون یقیناً اقلیتوں کے ہاتھوں خطرے میں ہے۔ یہودی فلسطین نے جو امن اور خوش حالی حاصل کرلی ہے وہ ایسی چیز نہیں ہے جسے وسطی مشرق کی مسلمان قومیں حاصل نہ کرسکتی ہوں۔

Givat Brenner ایک اسرائیلی گاؤں کا نام ہے۔ میں اس گاؤں کو دیکھنے گیا تھا اور جب میں اسکے

ر سبز کھیتوں میں گھوم رہا تھا، میں نے دیکھا کہ سیاہ چادریں اوڑھے عرب عورتوں اور پھٹے پرانے کپڑے پہنے عرب بچوں کے ہجوم نے ایک یہودی کی گاڑی پر ہلہ بول دیا ہے۔ میں نے اسے فرقہ وارانہ بلوہ سمجھ کر گاؤں کے سکریٹری سے سوال کیا تو اس نے جواب میں کہا کہ بلوہ نہیں ہے بلکہ جب کوڑے کی گاڑی آتی ہے تو یہ لوگ اس میں سے کچھ کارآمد چیزیں ڈھونڈھنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں اور گودڑ وغیرہ چن لے جاتے ہیں۔

یہودیوں کے پاس کوئی نیا موسیٰ نہیں آیا جس نے اپنا عصا مار کر فلسطین میں پانی کے چشمے جاری کر دئے ہوں، بلکہ یہودیوں نے اسی زمین سے پانی نکال کر صحرا کو سیراب کیا اور زمین کو زرخیز بنا دیا ہے۔ انھوں نے ایک کے سوا باقی سب دلدلوں کو خشک کر کے طاعون اور ملیریا کو ختم کر دیا ہے جو صدیوں سے عرب باشندوں کے لئے مصیبت بنے ہوئے تھے۔ ان لوگوں نے صحرا اور پہاڑیوں پر اپنا پسینہ اور روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ ایشیا و افریقہ میں یہودیوں سے زیادہ ہوشیار اور محنتی شاید ہی کوئی ہو۔ ان مقامات کی مردہ زمین میں اس طرح کہیں بھی جان نہیں ڈالی گئی کہ بیابانوں میں روئی اور پھل اُگنے لگے ہوں۔ ازکار رفتہ مویشیوں کو نئی زندگی دینا، بھیڑ، بکریوں اور دیگر مویشی کو کارآمد و نفع بخش بنا لینا اور پولٹری کی افراط اس میں شک نہیں بڑا کارنامہ ہے۔

اسرائیل کے یہودی دولت مند تو نہیں بن گئے ہیں مگر سالانہ ایک جوڑا کپڑا اور جوتا جس کا ذکر ولکی نے کیا تھا ضرور خرید سکتے ہیں۔ یہ بات عرب ملکوں کے لئے خواب کا درجہ رکھتی ہے۔

اس کتاب کے صحیح مخاطب چونکہ امریکن لوگ ہیں اس لئے میں نے ایران کے ذکر کو زیادہ جگہ دی ہے۔ میں نے جن ملکوں کی سیاحت کی ان میں ایران سب سے زیادہ دلکش ملک ہے۔ ایک غیر ملکی نے ایران کو "امریکہ کی لاڈلی" کا نام دیا تھا۔ بلاشبہ روس اور امریکہ کی کشاکش میں ایران کنجی کا درجہ رکھتا ہے، اس لئے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں ایران تو امریکہ کی لاڈلی ہونا چاہئے۔

ایک انگریز مصنف (A. C. Edwards) نے لکھا ہے کہ "ایران میں جو حکومت بھی قایم ہوتی ہے، بیشتر برطانوی یا روسی سفارت خانے کی اشارہ سے قایم ہوتی ہے۔ مجھے اس پر اعتراض ہے۔ کیونکہ غیر ملکی اثر کے اعتبار سے امریکہ، روس اور برطانیہ دونوں پر سبقت لے گیا ہے۔ چنانچہ آج ایرانی فوج کی نئی تنظیم، امریکن فوجی مشن کے ہاتھوں ہو رہی ہے اور پولیس کو از سر نو منظم کرنے کے لئے بھی امریکہ ہی کا ایک فوجی افسر مقرر کیا گیا ہے۔

امریکہ کے دوست اور دشمن، صحیح یا غلط طور پر، سنہ ۴۶ء میں ایران کو صوبۂ آذربیجان میں جو کامرانی حاصل ہوئی اس کا سبب امریکہ ہی کو قرار دیتے ہیں اور وزیر اعظم غضام نے روس سے تیل کی جن مراعات کا وعدہ کیا تھا اور سنہ ۴۷ء میں مجلس نے جشن استقلال کے ساتھ اس روسی مطالبہ کو مسترد کیا، وہ بھی امریکہ کے اثر و نفوذ ہی کا نتیجہ تھا۔

لیکن امریکہ کے اس اثر و نفوذ کے باوجود ایران کا مسئلہ واشنگٹن کے لئے ایک مشکل مسئلہ بنا ہوا ہے اور آیندہ امریکہ کا یہ اثر رہے یا نہ رہے لیکن میں اپنے یقین کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ ایران کے بارے میں واشنگٹن کو جتنی وسیع اور مکمل معلومات حاصل ہیں ایسی وسط ایشیا کے کسی دوسرے ملک کے بارے میں حاصل نہیں ہیں۔ جاج ایلن کی سفارت کے زمانہ میں، جو خود ایک صحافی رہ چکا تھا۔ اس کے اسٹاف کی توجہ سے ایرانی زندگی کا کوئی پہلو مشکل سے بچ سکا۔

Morrin Knudsen کے انجینرنگ فرم کی آٹھ سو صفحے کی رپورٹ ایران کے متعلق اطلاعات کا ایک خزانہ ہے۔ یہ رپورٹ حکومت ایران کی خواہش پر اس فرم کے ماہروں نے طیار کی تھی، لیکن یہ رپورٹ شایع نہیں ہوئی۔ مجھے طہران نیشنل بنک کے گورنر نے اس کی کاپی دیکھنے کو دی تھی اور اس سے میں نے اندازہ کیا کہ یہ رپورٹ ایران کی کتنی بڑی خدمت ہے۔ ایران کے متعلق ماسکو اور واشنگٹن کے درمیان جو معرکہ بھی ہو اور اس ملک میں امریکہ کی موجودہ پوزیشن باقی رہے یا نہ رہے، لیکن جو مواد اور معلومات امریکہ کے پاس ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ایران کے باب میں پریسیڈنٹ کانگریس کوئی غلطی کر بیٹھے تو اس کا سبب یہ نہ ہوگا کہ امریکہ کو یہاں کی بابت کافی اطلاعات حاصل نہ تھیں۔

ان تمام حالات کے پیشِ نظر یہ ماننا پڑے گا کہ اس وقت اسرائیلی حکومت ہی تنہا ایسی حکومت ہے جو نہ صرف ایران بلکہ مصر، عراق اور شام وغیرہ کیلئے بھی نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ اسرائیلی اصولِ ترقی جوں کے توں ان ملکوں کے لئے موزوں ہوں گے لیکن یہ ضرور سمجھتا ہوں کہ وہ یہودی حکومت کو سامنے رکھکر بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

فلسطین کے یہودیوں کے بارے میں لارنس آف عربیا نے تیس سال پہلے لکھا تھا:۔

> "ان کی (یہودیوں کی) اسکیموں کی کامیابی کا انحصار اس پہ ہوگا کہ موجودہ عرب آبادی خود ان کی (یہودیوں کی) مادی و اقتصادی سطح پر آجائے۔ یہ کام یہودیوں کی ترقی کر لینے کے فوراً بعد شروع ہوجانا چاہئے۔ ایسا ہوسکا تو عرب دنیا کے مستقبل کے لئے اہم نتیجے رونما ہوسکیں گے"

اسرائیلی حکومت سے عربوں کی دشمنی کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو، لیکن اب وہ اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ یہودیوں نے کس کامیابی کے ساتھ اپنے مسایل کو حل کیا اور اسے نظر انداز کر دینا بالکل ایسی بات ہوگی جیسے ڈاکٹر کسی کو پنسلین تجویز کرے اور وہ انکار کر دے محض اس لئے کہ اس علاج سے اس کا پڑوسی جس سے اس مرض کی مخالفت تھی شفا پا چکا ہے۔

---

# پہلا باب

## (ایران)

**دُنیا کے سرے پر** اپنا سفر میں نے جینیوا (سوئٹزرلینڈ) سے شروع کیا، اور طہراؔن پہونچکر مجھے محسوس ہوا کہ میں دُنیا کے آخری سرے پر پہونچ گیا ہوں۔ طہراؔن، ایراؔن کا بہت بڑا، نئی وضع قطع کا شہر ہے، جس کی آبادی ساڑھے سات لاکھ ہے، مگر ہوائی جہاز یہاں بہت کم آتے ہیں، کیونکہ اس طرف مسافروں کی آمدورفت اتنی کم ہے کہ ہوائی کمپنیاں اپنے اڈوں کے مصارف نہیں نکال سکتیں۔

امرؔیکہ کی ہوائی ڈاک پندرہ دن سے پہلے تہراؔن میں تقسیم نہیں ہوتی اور کبھی کبھی پورا مہینہ لگ جاتا ہے۔ یورپ کے اخباروں کا تہراؔن کے گلی کوچوں میں بکنا تو بڑی بات ہے، اخبار فروشوں کے ہاں بھی نہیں ملتے۔ اور اگر پہونچتے بھی ہیں تو بہت دیر میں۔ ہاں قریب کے روسی علاقے کے اخبار ضرور آجاتے ہیں، مگر روسی زبان جاننے والوں کے لئے بھی ان میں دنیا کی خبریں خاص ترتیب و سلیقہ کے ساتھ نہیں دیجاتیں۔

دُنیا کے حالات سے بے خبری کا احساس جتنا مجھے طہراؔن میں ہوا، کہیں نہیں ہوا۔ جن سیاحوں کی اپنے ملک کے سفارت خانوں تک پہونچ ہوتی ہے وہ البتہ طہراؔن میں دنیا کے حالات و واقعات سے اتنے بے خبر نہیں رہتے کیونکہ ہر سفارت خانہ تازہ خبریں حاصل کرنے کا انتظام رکھتا ہے، لیکن غیر ملکی سیاح جس کی رسائی اپنے سفارتخانہ تک نہیں دُنیا کے حالات سے بالکل بے خبر رہتا ہے۔ غیر ملکی زبانوں میں سے صرف فرانسیسی زبان کا ایک اخبار "ژوزال دو تہران" یہاں چھپتا ہے۔ مگر اس اخبار میں صحافت کی تمام خوبیاں ہوتے کے باوجود دنیا کے تازہ واقعات کی صحیح اطلاع نہیں ملتی۔ چنانچہ میرے قیام طہران کے دوران میں دو مرتبہ یہ افواہ اُڑی کہ روس و امرؔیکہ میں جنگ چھڑ گئی ہے۔

تہراؔن صحیح معنے میں مشرق ہے، پُرسکون و خوابیدہ! تہراؔن کو شورش و ہنگامہ بھی بمشکل جنبش دے سکتا ہے۔ اس شہر کے حال و مزاج کا اندازہ یہاں کے فقیروں اور کتوں سے ہوتا ہے: افرؔیقہ و ایشیا کے سارے

فقیروں میں تہران کا فقیر بڑا مسکین وخوش مزاج فقیر ہے۔ یہاں ہر موڑ پر، ہر گلی کوچے میں میلے کچیلے، لنگڑے لولے نظر آتے ہیں، کوئی بیساکھیوں پر چل رہا ہے، تو کوئی سکڑا ہوا پڑا ہے، کوئی بے ٹانگوں کے گھسٹ رہا ہے تو کوئی درخت یا دیوار کا سہارا لئے کھڑا ہے، ان کا ٹھکانا راستے اور فٹ پاتھ ہیں، جہاں بیٹھتے ہیں وہیں سو جاتے ہیں اور سوتے وقت اپنی ٹوپی اُلٹی کرکے رکھ دیتے ہیں تاکہ گزرنے والے خیرات کی یاد نہ بھولیں۔ تہران کے فقیر براہ راست سوال نہیں کرتے۔ میرے قیام تہران میں صرف ایک فقیر نے مجھ سے سوال کیا اور دور تک پیچھا بھی کیا۔ اس کے برخلاف قاہرہ کے فقیر جب انھیں مایوسی ہوتی ہے تو برا بھلا کہنے سے بھی باز نہیں رہتے۔

تہران کو شہر نہیں بلکہ ایک تمدن کہا جائے تو زیادہ صحیح ہوگا، اور تمدن بھی ایک نہیں بلکہ مختلف تمدنوں کا مجموعہ۔ جس کھیت کی کیاریوں میں یکساں طور پر پانی نہ پہونچے گا پیداوار اتنی ہی ناہموار ہوگی۔ یہی کیفیت تہرانی کلچر کی ہے۔ پرانے بازار تنگ پٹے ہوئے ہیں جہاں نہ گرمیوں کی تپا دینے والی دھوپ ستا سکتی ہے اور نہ سردیوں کی برفباری۔ پرانے شہر کی گلیاں ٹیڑھی میڑھی ہیں، اور بازاروں میں کافی شور ہوتا رہتا ہے، سردی کے موسم میں دہکتی ہوئی انگیٹھیاں ہر جگہ دکھائی دیتی ہیں؛ بو اور خوشبو، جھنکاریں اور راگنیاں، طہران کی قدامت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔

لیکن پرانی آبادی سے باہر، ہر طرف کشادہ سڑکیں اور خیابان ہیں۔ سڑکوں پر سایہ دار درختوں کی دورویہ قطاریں، جھلسا دینے والی دھوپ سے پناہ دیتی اور آنکھوں کو طراوٹ پہونچاتی ہیں۔ گرمی کے موسم میں خاص طور پر ٹھنڈے پانی کے مشکیزے اُٹھائے، سقے پیاسوں کو پکار پکار کر پانی پلاتے پھرتے ہیں ایران میں دودھ بھی مشکیزوں ہی میں لایا جاتا ہے، اور اس وجہ سے خراب بھی جلدی ہو جاتا ہے۔

ٹیکسی اور بس سروس کا انتظام حال ہی میں ہوا ہے، اور سچ یہ ہے کہ تہران کی یہ سروس بہترین سروس ہے۔ نئی، خوبصورت اور چمکیلی گاڑیوں کا ایک بیڑہ انگلستان سے یہاں پہونچا ہے۔ طہران کی ٹیکسی سروس اس میں شک نہیں قابل رشک چیز ہے۔ البتہ بوڑھا "درشکی" (کوچبان) اس سے خوش نہیں ہے۔

سارے شہر میں ہمہ وقت، یہ تیز رو اور سستی ٹیکسیاں دوڑتی پھرتی ہیں، اور بھروسے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس باب میں سہولت و آرام کے اعتبار سے تہران کو دنیا بھر کے شہروں پر فوقیت حاصل ہے۔

نقل وحمل کی اس خوبصورت و راحت رساں سواری کے ساتھ ساتھ باربرداری کے گدھوں اور اونٹوں کی قطاریں بھی سڑکوں پر دیکھی جاتی ہیں، اس لئے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ طہران کا چہرہ جوان اور جسم بوڑھا ہے اور یہ کارنامہ ہے رضا شاہ پہلوی کا۔

رضا شاہ اور روسی زار پیٹر اعظم میں مماثلت تام ہے۔ پیٹر کی طرح رضا شاہ، ایران کی پستی سے بیزار ہو کر

اسے یورپ کے سانچے میں ڈھال لینے پر تل گئے تھے، کچے مکان اور چھپر ڈھا دئے گئے، کچ پچ گلیاں صاف کی گئیں، بدبودار چشمے اور تالاب خشک ہوئے، اور ان کی جگہ نئی اور عالیشان عمارتیں، سیدھی اور وسیع سڑکیں اور بازار بن گئے۔ پیٹر کی طرح رضا شاہ نے بھی ناراضی و مخالفت کی پروا نہ کرکے سختی سے کام لیا، اور جس طرح روس کی آبادی پیٹر سے خوف زدہ تھی اسی طرح ایرانی عوام رضا شاہ سے ڈرتے تھے۔ ایرانیوں نے صدیوں سے زندگی میں اتنا تیز انقلاب نہیں دیکھا تھا کہ سروں کی پگڑیاں دم بھر میں ہیٹ کی صورت اختیار کرلیں، اور لمبی عبائیں کوٹ پتلون بن جائیں۔ ایرانیوں کے خواب میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ نقاب پوش خاتونیں دیکھتے دیکھتے نقاب ترک کرکے میم بن جائیں گی!۔

۱۹۳۶ء میں ایرانی عورتیں ریسٹوراں اور سینما گھروں میں داخل ہوئیں۔ شروع شروع میں کم عورتوں نے ایسی دلیری دکھائی! لیکن ۱۹۳۶ء میں جب تہران گرل ہائی اسکول کی لڑکیوں نے ورزش کی نمائش کی اور رضا شاہ، مع اپنی ملکہ اور شہزادیوں کے مغربی لباس میں یہاں آئے تو گو اس واقعہ سے ملک بھر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ اسی روز سے ایرانی رسم و رواج تیزی سے بدلنے لگے۔ کم از کم نئے تہران میں، آج نقاب پوش عورت نہیں دیکھی جاتی۔ اور اگر دیکھی بھی جائے تو خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ نقاب یا تو شناخت کرنے کے لئے ہے یا پھر چہرہ عیب دار ہے۔ اس کے باوجود پرانی عادتیں ابھی تک باقی ہیں! ایرانی مرد عورت ہاتھ میں ہاتھ دیکر نہیں چلتے، بجز ان چند نوجوانوں کے جو یورپ وامریکہ سے تعلیم پاکر واپس آئے ہیں۔

جدید ایرانی عورت ایک غیر ملکی زبان ضرور جانتی ہے اور قہوہ خانوں یا باغوں میں اتنی ہی آزاد و بے تکلف نظر آتی ہے جتنی کوئی یوربین عورت۔ لیکن یہ جدید ایرانی عورت کسی دوست بلکہ منگیتر کے ساتھ بھی تنہا تفریح کو نہیں نکلتی۔ باپ یا بھائی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔

غیر ملکی سیاح جب تہران میں داخل ہوتا ہے تو شہر کی خوبصورتی اور صفائی سے بہت متاثر ہوتا ہے! شہر و بازار کا نقشہ، جدید اور عالیشان عمارتوں کی قطاریں، وسیع چکیلی سڑکیں، چاق چوبند پولیس کے سپاہی، یہ سب باتیں اسے یوروپ کی یاد دلا دیتی ہیں۔ لیکن اس حسین و دلکش چہرے کے نیچے وہ سن رسیدہ جھریاں پڑے ہوئے جسم کی جھلک بھی دیکھتا ہے۔

روشن خیال رضا شاہ نے پایۂ تخت میں نلوں کے ذریعہ سے پانی کی بہم رسانی اور حفظان صحت کے اصول پر توجہ نہیں کی۔ تہران میں پہاڑوں کا پانی کھلی نالیوں میں شہر کے ہر کوچہ و بازار میں بہتا نظر آتا ہے شہر کی ساری گندگی ان نالیوں میں بہتی ہے اور یہیں کپڑے دھوئے جاتے ہیں، لوگ نہاتے ہیں اور جانور

پانی پیتے ہیں۔

حال میں ایک برٹش انجینئرنگ فرم کو تہران کی آب رسانی اور زمین دوز بدر رو بنانے کا کام سپرد کیا گیا ہے۔

تہران کی زندگی میں قدیم "دیروز" اور جدید "فردا" آپس میں اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں، جیسے کانٹوں کے درخت پر گلاب کی بیل۔ لیکن ایسا ہوتے ہوئے بھی ایرانی قوم نہ تو سست و کاہل ہے اور نہ اسکے اندر شکست خوردگی کا انداز پایا جاتا ہے! کم ازکم تہران کا سیاح تو یہی کہے گا۔

جس ایرانی کو دیکھئے سر اٹھائے تیزی سے ہاتھ ہلاتا ہوا چلتا ہے، ایرانیوں کو شائستگی کا خیال ہر وقت رہتا ہے۔ افتادِ طبع و مزاج کے اعتبار سے ایرانیوں اور فرانسیسیوں میں مماثلت ہے اور شاید اسی لئے فرانس کی ثقافت و زبان ایران میں زیادہ مقبول ہے۔ ایک ایرانی کتنی ہی خستہ حالت میں ہو، افسردہ و غمگین نظر نہیں آتا، وہ اس وقت بھی اداس نہیں معلوم ہوتا جب وہ اپنے گھر یا دوکان پر پالتی مارے بیٹھا ایرانی ریڈیو کے غمگین نغمے سنتا ہوتا ہے۔ (مغربی کانوں کو یہاں کی موسیقی اُداس ہی معلوم ہوتی ہے)

اوسطاً ایرانی چھریرے بدن کا مستقل مزاج انسان ہوتا ہے، موٹا آدمی یہاں بہت کم دیکھنے میں آتا ہے اور جب نظر آجاتا ہے تو انگلیاں بھی اُٹھ جاتی ہیں، ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے باتوں باتوں میں کہا کہ "ہمارے سب موٹے آدمی پارلیمنٹ میں ہیں"۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ الیکشن میں زیادہ تر تاجر اور زمیندار ہی چنے جاتے ہیں جن کو عمر بھر کوئی کام نہیں کرنا پڑتا اور عیش و آرام آدمی کو موٹا بنا ہی دیتا ہے

ایک طہرانی ادیب سے میں نے سوال کیا:-

"کیا آپ کے ملک میں لوگ خودکشی بھی کرتے ہیں؟" —————— اس نے جواب دیا

"ہاں مگر بہت کم، کیونکہ ہماری قوم بڑے بڑے دشوار حالات سے گزر چکی ہے، اور کوہ و صحرا نے ہماری زندگی کو صعب و دشوار بنا دیا ہے اس لئے کوئی مصیبت ہمیں مایوس نہیں کرتی، ہم ہر حالت میں جمے رہتے ہیں"

قاہرہ کے بازاروں میں گزرتے وقت وہاں کی بھیڑ بھاڑ اور قہوہ خانوں کی رونق و آبادی دیکھکر میں سوچتا تھا کہ مصری کام کس وقت کرتے ہیں؟ لیکن جب میں تہران کے گلی کوچوں میں گھوما تو وہ سوال اُلٹا ہو گیا یعنی ایرانی راحت و آرام کس وقت کرتا ہے؟ گرمی کے موسم میں تہران کی تمام دوکانیں زیادہ دیر تک بند رہتی ہیں۔ اس وقفے کے علاوہ میں نے ایرانیوں کو ہر وقت مصروف اور کام کرتے دیکھا۔ شاید کام کرتے رہنا ایرانی خون میں داخل ہے۔ ہر ایرانی جو طبقۂ اشراف میں شمار نہیں ہوتا ہر وقت مصروف نظر آئے گا۔

اشراف ایرانی بے شک اپنے ہات سے کام کرنے کو ذلیل سمجھتے ہیں، تاجر و زمیندار کی طرح اہلِ فن (مثلاً انجینیر وغیرہ) بھی اس بیماری میں مبتلا نظر آتے ہیں اور اپنے ہات سے کوئی کام نہیں کرتے۔ ہر کام کے لئے نوکر کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایرانی سرمایہ داروں میں آپ کو کوئی ایسا آدمی نہ ملے گا جو امریکی سرمایہ دار کی طرح ضرورت کے وقت آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جائے۔ جنگ کے زمانہ میں جب ایران میں امریکی فوجوں کے افسر راستے میں خود اپنی موٹر درست کرنے لگتے تو اس منظر سے ایرانی شرفاء کو حیرت ہوتی تھی۔

جب زرتشتی تعلیمات پر نظر پڑتی ہے تو جسمانی محنت اور ہات سے کام کرنے سے شرفائے ایران کی یہ بیزاری زیادہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے، زرتشتی تمدن میں محنت و مشقت پر بڑا زور دیا جاتا تھا۔ ہل چلانا، کنواں کھودنا، کاشت کرنا، درخت لگانا اور مویشی پالنا بلند انسانیت کا ثبوت تھے، زند اوستا میں لکھا ہے کہ

"جو محنت و توجہ سے زمین بوتا جوتتا ہے وہ ایسا ذخیرہ اکٹھا کرتا ہے جو دس ہزار عبادتوں سے افضل ہے!" راستگوئی اور مویشیوں کی خدمت اونچے درجے کی نیکیاں تھیں۔ آج کی ایرانی زندگی میں اس ضابطۂ اخلاق کی طرف سے بے اعتنائی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ میرے تہران پہونچنے کے چند ہی دن بعد ایک انگریزی تعلیم پائے ہوئے ایرانی نے مجھ سے کہا:-

"ایرانیوں کے متعلق پہلے تمھیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ وہ بہت جھوٹے ہیں!"

"تم تو جھوٹے نہیں؟" میں نے مذاقاً کہا۔

"میں ایک ایرانی ہوں!" اس کا بلیغ جواب تھا۔

"یعنی؟" میں نے وضاحت چاہی۔

اس نے کہا: "اگر تم اس کو سمجھنا ہی چاہتے ہو تو تمھیں ہماری قومی تاریخ پڑھنا چاہئے۔ زمانۂ تاریخ میں ایرانی قوم نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں، بڑے بڑے فاتحوں، غیر ملکی مدبروں اور خود ایرانی حکمرانوں نے قوم کو اتنا رگیدا ہے کہ تحفظ ذات کے لئے جھوٹ سے کام لینا ایک فطری اور موثر حیلہ بن گیا ہے۔ تم شاید مجھ سے اتفاق نہ کروگے، لیکن اگر ایرانی شاہنشاہوں کے مفتوح ہو جانے اور ایران پر عربوں کے قابض ہو جانے کی تاریخ کا مطالعہ کرلو گے تو میرے ہم خیال بن جاؤگے۔"

تعلیمیافتہ ایرانیوں میں میں نے یہ قابل تعریف خصوصیت پائی کہ وہ اپنی قومی کمزوریوں کے اعتراف میں تامل نہیں کرتے۔ اور اس اعتبار سے ایرانی تمام مسلم قوموں پر فوقیت رکھتے ہیں۔ حکومت ایران کے اقتصادی مشیر A. C. MILSPAUGH نے ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر علی دشتی کا یہ قول نقل کیا ہے:-

"ہمیں خودستائی کا مریض نہ ہونا چاہئے اگر کسریٰ نے کسی عہد میں ساری دنیا فتح کرلی تھی تو کیا، آج تو

حالت یہ ہے کہ جتنے غدار، و خائن ایران میں ملیں گے کسی دوسری قوم میں نہیں ملیں گے اور جس طرح ایران میں ایسے لوگ قانون کی زد سے محفوظ ہیں ویسے کسی دوسرے ملک میں نہیں ہونگے!"

ایران کی سیاست میں ریشہ دوانیوں اور دروغ بافیوں نے ایران کے سنجیدہ لوگوں کو اس قدر بیزار کر دیا ہے کہ مجلس کے ایک ممبر نے دوران گفتگو میں مجھسے کہا کہ "میرا کتا البتہ مجھ سے جھوٹ نہیں بولتا!"

میری ملاقات ایران کے سب پڑھے لکھے افراد اور یونیورسٹی کے پروفیسروں سے ہوئی اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ سب زرتشتی ضابطۂ اخلاق کو زندہ کرنے کے کتنے متمنی ہیں۔ ایک اہلِ قلم نے ایکبار کہا کہ

"ہماری قوم جب ہی عظمت پا سکتی ہے جبکہ ایکبار پھر زرتشت ہمارے دل و دماغ پر حکمرانی کرنے لگے!"

میں نے کہا:۔ "لیکن امتداد وقت کے ساتھ زرتشتی اصول میں بھی تو فرق آگیا تھا!"

اس نے جواب میں کہا:۔

"صحیح کہ ایسا ہوا، لیکن گرا ہوا مکان پھر سے تعمیر کیا جا سکتا ہے: زرتشتی ضابطہ اخلاق ہمارا "ایرانی مکان" تھا، ہماری اچھائیوں کا "ایرانی مندر" تھا، جسے ہم نے اپنے ہی ہاتھوں سے بنایا تھا، اور اس روحانی مسالہ سے بنایا تھا جو ہمارے ہی ملک کا تھا۔ عربوں کی طرح ہم صحرائی انسان نہ کبھی تھے اور نہ آج ہیں — اسلام کے اندر بڑی خوبیاں ہیں، لیکن ان خوبیوں کے باوجود اسلام بدویوں کا مذہب ہے۔ ہمارے وہ شعرا بھی جو بڑے سخت مسلمان تھے (جیسے نظامی، سعدی) زندگی کے بڑے شیدا اور رومان کے متوالے تھے۔ وہ اسلامی تقشف کو قبول نہیں کر سکے، ان کی روح ایرانی روح تھی!"

ایران کی سماجی زندگی میں بعض اور بھی خرابیاں ہیں جن کے ذکر سے آجکل کے مغربی سیاح کو بہت دُکھ پہونچتا ہے۔ مثلاً "آپ میرے گاؤں آئے!" یہ جملہ میں نے ایک ایرانی زمیندار سے اپنے پہلے سفر ایران کے دوران ۱۹۲۲ء میں سنا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "آپ کتنے گاؤں کے مالک ہیں؟" — "میں بائیس گاؤں کا مالک ہوں!" یہ جواب دیتے وقت میں نے محسوس کیا کہ اس ایرانی زمیندار کو کسی قسم کی ناخوشگواری یا بُرائی کا احساس نہ تھا۔ یہ درست ہے کہ ایران میں غلامی کا رواج نہیں ہے اور زراعتی پیداوار کی طرح کسانوں کو فروخت نہیں کر دیا جاتا ہے۔ مگر چونکہ اسّی فیصدی زمین زمینداروں کی ملکیت ہے۔ اس لئے اسکے اندر "ملکیت کا شعور" جڑ پکڑ گیا ہے۔ ایرانی کسان جہاں چاہے جا بھی سکتا ہے اور تعلیم پاکر اونچے سے اونچے مرتبے تک پہونچ بھی سکتا ہے، لارڈ کرزن نے اپنی قابل ذکر کتاب میں لکھا ہے کہ "اس اعتبار سے ایران دُنیا بھر میں سب سے زیادہ جمہوری ملک ہے کہ وہاں اونچے نیچے کی تفریق مطلق نہیں ہے اور ہر شخص ذاتی جوہر کی بنیاد پر بڑے سے بڑا رتبہ پا سکتا ہے۔" رضا شاہ کی ذات خود اس کا ثبوت ہے، لیکن ایران کا دیہاتی

اپنی تمام نارسائیوں کے باوجود اپنی جگہ نہیں چھوڑتا، اور یہ جبر بھی برداشت کرلیتا ہے کہ پارلیمنٹ کے چناؤ میں زمیندار کی مرضی کے مطابق ووٹ دے۔ مغرب کے مفہوم میں یہ بات اصول جمہوریت کے منافی ہے۔

میری آخری سیاحت ایران ۱۹۵۷ء میں ہوئی، اور میرے وہاں پہونچنے کے فوراً بعد میرے ایک ادیب دوست نے مجھے شوقیہ ڈراما کرنے والوں کے ایک جلسہ میں مدعو کیا۔ ہم تھیٹر میں بیٹھے پردہ اُٹھنے کا انتظار کر رہے تھے، میرے دوست کا ایک دوست جو نہایت اعلیٰ انگریزی بولتا تھا، ہمارے پاس آیا اور مزاج پُرسی کے بعد اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر تماشائیوں کو دیکھا جو بالعموم پستے کھا رہے تھے، اور کہنے لگا "یہ سب تیسرے درجے کے لوگ ہیں!" اس کا یہ کہنا نفرت وحقارت کی بنا پر نہ تھا، بلکہ اس کا مقصود مجھے یہ بتانا تھا کہ اول درجے کے ایرانی ایسے بدتمیز نہیں ہوتے جو تھیٹر میں پستے کھاتے رہیں۔ بایں ہمہ، اس کا یہ کہنا میرے لئے خاص معنے اور اہمیت رکھتا تھا۔ ایران میں اگرچہ ہندوستان کی طرح نیچے اونچ نہیں ہیں لیکن اول درجے اور تیسرے درجے کے لوگ ایرانی سماج میں بھی ہیں۔ دوسرے درجے والے اول تو وہاں ہیں نہیں اور اگر چند نفوس ہیں تو وہ آسانی سے اول یا تیسرے میں رکھے جا سکتے ہیں۔ اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ایرانی سماج میں درمیانی کڑی غائب ہے۔

تہران کافی بڑا شہر ہے مگر وہاں بڑی اور نازک چیزیں نہیں بنتیں، وہاں کی فیکٹریاں بھی ایسی چیزیں طیار نہیں کرتیں۔ صنعتی پیداوار کا بڑا حصہ ہاتھوں اور سادہ اوزاروں سے طیار کیا جاتا ہے۔ ایرانی دماغ فوری ضرورت کے لئے بہت سی چیزیں نہایت خوشنما وضع کی طیار کر سکتا ہے۔ حرفت و دستکاری کا شوق اور مستقل مزاجی ایرانی کاریگر کے مخصوص اوصاف ہیں۔ نئی بسوں کی "باڈیز" بھی ہاتھ ہی سے بنائی جاتی ہیں۔ چاندی اور دوسری دھاتوں کی چیزوں پر باریک قسم کی نقاشی، قالین بافی اور چوب کاری کی نزاکتیں خیابان لالہ زار کی دوکانوں میں بکثرت دیکھی جا سکتی ہیں جو سچ مچ حیرتناک ہیں — پُرانا ایران اہل حرفہ اور دستکاروں کا ملک تھا اور دُنیا میں مشہور تھا۔ نیا ایران بھی دستکاروں ہی کا ملک ہے اور اگرچہ پرانی عظمت وشان کے ساتھ بہت سے فنی تصورات ختم ہو گئے ہیں مگر اصفہان کے سماوار، شیراز کے نقرئی ظروف اور قالین آج بھی دُنیا میں بے مثل سمجھے جاتے ہیں — ایران کی پیداوار بیشتر مضبوط اور چست چالاک ہاتھوں کی مرہون ہے۔ ایک امریکن افسر نے خوب کہا کہ "تین چوتھائی ملین ایرانیوں میں سے ساڑھے سات لاکھ ایرانی صرف اپنے لئے تجارت کرتا ہے۔ خیابان لالہ زار میں دوکانیں بہت ہیں مگر ڈپارٹمنٹل اسٹور کوئی نہیں ہے۔ کاریگر بوڑھے بچے چیزیں طیار کر کے زیادہ تر خود ہی بازار میں لاتے اور فروخت کرتے ہیں۔

قاہرہ میں شاید اس وجہ سے کہ وہاں غیر ملکی آبادی زیادہ اور ایک عظیم الشان یونیورسٹی ہے، غیر ملکی کتابو

کی دو کانیں بہت ہیں مگر تہران میں بہت ہیں - تہران میں بہت بڑی آبادی کے باوجود چند ہی دو کانیں ایسی ملینگی جہاں غیر ملکی مطبوعات مل سکیں - ایران میں جبریہ ولازمی تعلیم کا قانون جاری ہے لیکن یہ عام تعلیم آج کی حقیقت نہیں، کل کی آرزو ہے! وزیر تعلیم ڈاکٹر صادق کے قول کے مطابق ۴۶ء میں ساڑھے تین لاکھ سے کم بچے اسکولوں میں جاتے تھے اور بارہ لاکھ نہیں جاتے تھے -

ایران کی راجدھانی میں سب سے زیادہ مقتدر اور سب سے زیادہ چھپنے والا اخبار اطلاعات ہے لیکن اسکی اشاعت بھی تیس ہزار سے زیادہ نہیں - چار ہزار کی اشاعت والا اخبار بھی کامیاب سمجھا جاتا ہے -

ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ غیر ملکی علمی مطبوعات کا بھوکا ہے اور افسانوی ادب سے لگاؤ نہیں رکھتا -

GONEWIIH THEWIND ایک ناول ایسا ہے جو دوسرے ملکوں کی طرح ایران میں بھی نہایت مقبول ہے -

تقریباً پچھتر سال ہوئے جب ناصرالدین شاہ قاچار نے یورپ کا سفر کیا تھا - اسوقت سے یورپ، خاص کر فرانس کے مشہور و مستند لکھنے والوں کے تقریباً دو ہزار ناول فارسی زبان میں منتقل ہو چکے ہیں - پڑھا لکھا ایرانی یورپی اہل قلم کی حقیقت نگاری کا شیدا ہے اور زندگی کی یہ ترجمانی اسکے ذہن و خیال کو مسحور کر لیتی ہے - اس لئے اسکا مطالعہ وسیع ہوتا رہتا ہے - ایرانی نوجوان عقل کی پختگی کے بعد تخئیلی ادب سے ہٹ کر سنجیدہ علمی مطالعے کی طرف مائل ہو جاتا ہے میں نے ایک مشہور ایرانی مصنف سے سوال کیا کہ "ایرانی تعلیم یافتہ طبقہ فلسفہ و نفسیات کے مطالعہ کا اتنا شایق کیوں ہے؟" اس نے جواب دیا "اس لئے کہ ہم ہنوز سیکھ رہے ہیں، ابھی تک صداقت کی تلاش میں ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، نئی اور پرانی دونوں صداقتوں کے لئے!" —— ہر ایرانی اپنے قدیم شعراء اور پیشوایان مذہب کا احترام کرتا اور انپر نازاں ہے - ہر ایرانی، کلاسکی شاعری کے وہ حصے جن میں قومی کردار کو سراہا گیا ہے اکثر گنگناتا رہتا ہے - مائیں بچوں کو لوریاں بھی ایسی ہی شاعری کی سناتی ہیں - اچھی قسم کے گپ خانے (چائے خانے) صرف شہروں میں نہیں، دیہات میں بھی ہیں، قصہ خواں نوکر رکھے جاتے ہیں جو لوگوں کو ایرانی شجاعت و بہادری کی داستانیں اور ایرانی فخر و سربلندی کے افکار سنایا کرتے ہیں —— ایران ایک ایسا ملک ہے جہاں کلاسکی شاعری سب سے بیش قیمت قومی ورثہ سمجھی جاتی ہے اور یہ جذبہ اعلیٰ و ادنیٰ دونوں طبقوں میں یکساں پایا جاتا ہے - لیکن نئی نسل کا ایرانی اس شاعری کے اعلیٰ جذبات و اشرف تصورات سے مطمئن نہیں کیونکہ اس شاعری میں قومی عظمت و ترقی کا نشان اسے نہیں ملتا - ایران کی نئی نسل کو شدید احساس ہے کہ نیا زمانہ بڑی طاقت ہے اور اس لئے بیک وقت عذاب بھی ہے اور بشارت بھی! نیا ایرانی جیمز اور برگساں کے ساتھ کارل مارکس کا فلسفہ بھی پڑھتا ہے؛ کیونکہ وہ اس نئے زمانہ کو سمجھنا چاہتا ہے - نیا ایرانی نئے زمانہ کو اس لئے سمجھنا چاہتا ہے کہ اسے یقین ہو گیا ہے کہ اسے نہ تو اس نئے زمانہ سے مفر ہے اور نہ وہ اسے بدل سکتا ہے، مگر وہ اس سے بچنا اور اسے بدلنا بھی چاہتا ہے -

# دوسرا باب

## (عقل و دانش کا مسکن)

صوبۂ فارس کی راجدھانی شیراز، ایرانی قوم کا محبوب و عزیز ترین شہر ہے، اور عقل و دانش کا مسکن سمجھا جاتا ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جسے ایرانی قوم کا گہوارہ کہنا چاہئے۔ ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کے احترام و محبت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس ملک کے لوگ آپس کی بات چیت میں تہران، اصفہان و ہمدان وغیرہ کی عیب جوئی تو کر سکتے ہیں، لیکن شیراز کا نام بے ادبی سے لینے کی جرأت کوئی نہیں کر سکتا۔ ایرانیوں کے دلوں میں شیراز کا احترام و اعزاز ایک معبد کی طرح ہے۔ اور اس کی اس تکریم و تحریم کا راز شیراز کی ادبی روایات سے وابستہ ہے۔

ایران کے سب سے زیادہ مقبول و محبوب شاعر سعدی و حافظ تھے جو اسی سرزمین میں دفن ہیں، جنکے مزار آج صدیاں گزر جانے کے بعد بھی زیارت گاہ عوام ہیں۔ یہ دونوں مقبرے ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں لوگ صاحبِ مزار سے عقیدت کی بنا پر اور اس جگہ کو بہترین تفریح گاہ سمجھ کر جاتے ہیں۔ جمعہ کے روز ہجوم زیادہ ہوتا ہے اور جا بجا قالینوں کے فرش پر بیٹھے، لوگ سماوار میں چائے دم کرتے، فنجان کے دور چلتے اور تار و رباب پر کلاسیکی غزلیں گاتے اور سنتے ہیں۔ میرے گاڑی والے نے مجھے بتایا کہ "یہاں تو جمعہ کے روز آئیے!"

سعدی و حافظ کی طرح تیسرا محبوب و مقبول شاعر خیام ہے۔ میں شیراز کے ہوٹل سعدی میں ٹھہرا تھا۔ ہوٹل کے ڈرائنگ ہال میں کسی ایرانی کی قلم کاری کا نتیجہ خیام کی ایک تصویر ٹنگی ہے۔ اس تصویر میں خیام کو ایک سفید ریش بوڑھا دکھایا گیا ہے جس کا عمامہ بھی سفید ہے لانبی عبا پہنے ہے، سامنے بادۂ شیراز کی بوتل ہے اور بغل میں ایک دوشیزہ، سیاہ گیسو بکھرائے بربط کے تاروں کو چھیڑ رہی ہے۔ ہم چند آدمی اس تصویر کو غور سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ایرانی بولا:-

"وہ تھا تو نیشاپوری جو یہاں سے دور ہے لیکن خیام خود شیرازی تھا!"

اس ایرانی کا مطلب یہ تھا کہ شیراز عبارت ہے حسن و رومان سے، شیراز رمز و علامت ہے ذہن و ذکاء کی، شیراز مجسمہ ہے زندگی کی شائستگی و نفاست کا، اور شیراز نام ہے شاعرانہ رموز و کنایات کا، اور سب سے بڑی بات یہ کہ ملّایانہ فرمان فرمائی کے خلاف تفلسف کی بغاوت نے شیراز کی صورت اختیار کرلی ہے!

تہران میں مجھ سے ایک تہرانی شاعر نے کہا تھا کہ اب تک تم جتنے ایرانیوں سے ملے ہو، شیرازی ان سب سے مختلف ہیں۔" اور یہ بات سچ نکلی۔ میں شیراز پہنچا تو ایک جوان عمر تاجر سے بھی ملاقات ہوئی، تعارف ہوتے ہی اس نے مجھ سے سوال کر دیا کہ کیا میں شعر کہتا ہوں؟ اور میرے انکار پر اسے حیرت بھی ہوئی۔ میرے سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شعر کہتا ہے، اس نے کہا:- "بلاشبہ! شیرازی سب شاعر ہوتے ہیں!"

اس کے خیال کے مطابق ایک پڑھا لکھا شیرازی شعر نہیں کہتا تو یا تو وہ پڑھا لکھا نہیں ہے یا شیرازی نہیں ہے۔ سعدی و حافظ، ہر چند بہت مقبول و ممتاز ہیں، لیکن ایرانی قوم اپنے تمام شاعروں سے محبت کرتی ہے، خیام، فردوسی اور نظامی بھی بے انتہا مقبول ہیں۔ یہ سوال ہر سوچنے والے کے دماغ میں آتا ہے کہ ایرانی اپنے شعراء سے ایسی غیر معمولی محبت و عقیدت کیوں رکھتے ہیں۔ اس سوال کا جواب غالباً اس حقیقت کے اندر پوشیدہ ہے کہ ایرانی زندگی سے محبت کرتا ہے، اور اسلامی تقشف کو اس روح سے کوئی مناسبت نہیں ہے ——— اور چونکہ ایرانی شعراء نے اپنے شعر میں ایرانی روح سمودی ہے اور اسلامی تقشف سے بغاوت کی ہو اسلئے ایرانی عوام ایسے باغی شعراء اور انکی شاعری کے شیدا ہیں۔ ایسے شعراء میں حافظ و خیام کا مرتبہ بہت بلند ہے۔

ایرانی شاعری میں زندہ دلی و خوش باشی کو بہت سراہا گیا ہے، لیکن اس کے اندر سماجی مقصد اور رجحانی ارتفاع کی تعلیم بھی دیکھی گئی ہے۔ چنانچہ ایران میں جب بھی کوئی ترقی پسندانہ تحریک اُٹھتی ہے تو حافظ کے اشعار اس تحریک کے نعرے بنتے ہیں۔ کیونکہ حافظ جس خوش باشی کی تعلیم دیتا ہے، وہ چند منتخب لوگوں کی خوش باشی نہیں بلکہ عامۃ الناس کی خوش باشی ہے! وہ ہر انسان کو خوش و خرم دیکھنے کا آرزو مند ہے۔

شیراز کی آبادی ایک لاکھ ہے۔ افلاس، ایران میں عام ہے مگر شیراز کی خصوصیت ہے۔ اسکے باوجود شیراز، ایران کے تمام شہروں میں سب سے زیادہ زندہ دل شہر ہے۔ یہ ایران کا ادبی مرکز و کلچری مستقر ہے۔ اس میں وہاں کے جغرافیے نے بھی مدد کی ہے۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں نے شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے، اور شہر سے میل بھر نکل جائیے تو قسم قسم کے وحوش و طیور اور خوبصورت درخت دیکھنے میں آئینگے شیراز کا گلاب آج بھی اتنا ہی حسین و دلفریب ہے جتنا حافظ کے عہد میں تھا، اور وہاں بلبل اب بھی پہلے ہی کی طرح غزلخواں ہے! شیراز کی سطح مرتفع، ہوا خوشگوار، مطلع صاف اور سورج چمکیلا ہے۔

مشرق وسطیٰ کی کسی قوم میں شیرازیوں کی سی زندہ دلی، شگفتہ مزاجی اور خودداری نہیں ملے گی۔ شیراز میں برقعہ پوش عورت کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ اصفہان و تبریز کی طرح شیراز کی عورتیں بھی بالعموم تعلیم سے بے بہرہ ہیں، اور ہر قسم کی روشن خیالی سے محروم ہونے کے باوجود برقعہ اوڑھنے پر راضی نہیں۔

یہ عقیدہ عام ہے کہ شیرازیوں کا خون اب تک خالص اور بے میل ہے۔ چنانچہ شیرازی عورت کی خوبصورتی سارے ایران میں عدیم المثال ہے اور ایک ایرانی کا یہ قول خاص اہمیت رکھتا ہے کہ: "ان کو مغربی لباس پہنا دیجئے، پھر دیکھئے!"

ہر چند شیراز میں افلاس بہت ہے لیکن اس افلاس نے شیرازیوں کے حسن و جمال کو متاثر نہیں کیا ہے، شیرازی عورت میلے کچیلے لباس میں بھی قمر طلعت نظر آتی ہے۔ اس کی غلافی سیاہ آنکھیں، سفید موتیوں سے دانت اور باریک ترشے ہوئے خدوخال اور شگفتہ روئی اس کی خصوصیات ہیں۔

شیرازی عورتیں بکثرت اور بلا تکلف دوکانداری کرتی اور سودا بیچتی ہیں۔ ایران کے دوسرے شہروں میں یہ بات نہیں ہے، میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت سودا بیچنے میں بے تکان سگریٹ پیتی جاتی ہے۔ راستہ اور بازار میں پیشہ ور عورتیں لوگوں کو اس بے تکلفی کے ساتھ مخاطب کرتی اور اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے سگریٹ کی فرمائش کرتی ہیں، جس طرح یورپ کے بڑے شہروں میں۔

شیراز کو اپنی قدیم عظمت اور ثقافتی سربلندی، اپنے دلفریب مضافات و ماحول، اپنے شہریوں کی خندہ روئی اور زندہ دلی کے باوجود ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کی خوشحالی و شادابی کا انحصار "آب رکناباد" پر تھا، جو اب سوکھتا جا رہا ہے۔ تیس سال سے پہلے رضا شاہ کے حکم سے بندر بوشہر بند کر دیا گیا۔ یہ حکم گویا شیراز کو پھانسی دینے کا حکم تھا۔ کیونکہ بندر بوشہر کی تجارت کا راستہ شیراز ہو کر تھا رضا شاہ کو ایرانی اگر برا کہتے ہیں تو صرف اسی ایک قصور کی بنا پر۔ کہا جاتا ہے کہ بندر بوشہر پھر سے کھول دینے کے سوال پر غور ہو رہا ہے۔ گو رضا شاہ کے حکم سے شیراز کو یہ نقصان پہونچا، مگر دوسری طرف وہاں کے تاجروں اور زمینداروں نے رفاہ عام کے وہ کام بھی کئے جن کی مثال دوسری جگہ مشکل سے ملے گی۔ شیراز کے بازار کشادہ و خوبصورت بنائے گئے اور واٹر ورکس قایم کیا گیا۔ یہ وہاں کے پیسے والوں کی عالی ہمتی کا نتیجہ تھا۔

پورے صوبۂ فارس کی آبادی بیس لاکھ ہے اور یہ علاقہ سب سے زیادہ زرخیز اور ہرا بھرا ہے فارس کی سرزمین ہر قسم کی زراعت کے لئے موزوں ہے، لیکن آبپاشی مفقود ہے، رکناباد کو خشک ہوتے دیکھ کر کنوئیں کھدوانے کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ ایک یورپی انجینئر نے پہلا کنواں کھودا تو فی گھنٹہ بیس ہزار

گیلن پانی دینے لگا۔ ایرآن کی عام پکار پانی کی ہے، حالانکہ زیر زمین پانی کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔

شیرآز کو بھکاریوں کا چھتہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا۔ ایرآن کے دوسرے شہروں میں اپاہج اور ناکارہ لوگ بھیک مانگتے نظر آتے ہیں مگر شیرآز میں کنبے کے کنبے یہی پیشہ کرتے ہیں۔ بوڑھے، جوان، عورت، مرد اور بچے ٹولیاں بناکر مانگتے ہیں۔

شیرآز میں مزدوروں کی گنتی پچاس ہزار ہے، جس میں فیکٹریوں میں کام کرنے والے صرف دو ہزار ہیں سرکاری محکموں میں اگرچہ تین ہزار آدمی لگے ہوئے ہیں مگر ان میں نصف تعداد فالتو ہے پینتیس ہزار ایسے ہیں جو گھروں میں رہ کر کوئی نہ کوئی چیز بناتے اور سد رمق حاصل کرتے ہیں۔ باقی دس ہزار سرکاری اطلاع کے مطابق بے روزگار ہیں۔

شیرازی، شعر شاعری کے شیدا ہیں، لیکن اس ذوق وانہماک کے باوجود نوے فیصدی آبادی بے پڑھی لکھی ہے۔ سارے شہر میں صرف دو سینما ہیں اور ایک طائفہ شوقیہ ڈراما کرنے والوں کا ہے۔ یہ شوقین ڈراما کرنے والے سب کے سب جدید تعلیم یافتہ ہیں۔ شیرآز میں اخبار تو آٹھ نکلتے ہیں لیکن ان کی مجموعی اشاعت تیس ہزار سے زیادہ نہیں، روزانہ ایک بھی نہیں ہے۔ پوری آبادی کے لئے صرف دو ہائی اسکول ہیں۔ کالج ایک بھی نہیں۔ برٹش کونسل نے ایک اینگلو ایرانین انسٹی ٹیوٹ جاری کر رکھا ہے۔ اسکی لائبریری ممبروں کے لئے کھلی ہے۔ یہ تنہا ادارہ ہے جو جدید کلچر کی ترویج کر رہا ہے۔

میرے شیرآز پہونچنے کے چند ہی روز بعد وہاں کے نوجوانوں نے جن کو جدید تعلیم ملی تھی میرے خیر مقدم میں ایک گارڈن پارٹی دی۔ یہ لوگ انگریزی یا فرانسیسی بخوبی بولتے تھے اور یورپی رسم وقواعد سے پوری طرح واقف تھے۔

میں خاموش ایرانیوں اور وسطی مشرق کی دوسری قوموں کا مقابلہ کرتا رہا۔ ایرانی جب دوستی کرلیتا ہے تو پھر نہایت دلکش طریق پر اور حیرت انگیز حد تک صاف بیانی سے کام لیتا ہے۔ فصاحت بیان ایرانی قوم کا جوہر مخصوص ہے، مگر اسی درجہ پر اس کی خود تنقیدی بھی ایک خصوصیت ہے۔

اس شام کو میں نے جس پارٹی میں شرکت کی تھی، وہاں خوش باشی اور گپ زنی کے سوا کوئی بات نہ تھی لیکن اس وقت بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایرآن کی یہ نئی نسل ایک عدالت ہے۔ بڑی بڑی شخصیتوں کے کردار و گفتار کی جانچ ہو رہی تھی اور بڑے بڑے عہدہ داروں کی بد اعمالیوں کی گرفت کی جا رہی تھی۔ دفعۃً یہ نوجوان مجسٹریٹ کہنے لگا:-

"آپ جانتے ہیں، میں ایک اچھا مسلمان ہوں مگر مسجد میں کبھی نہیں جاتا! اس لئے کہ مجھے ملا سے

سخت نفرت ہے"۔ تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد پھر کہنے لگا۔ "میں آپ کو بتاتا ہوں کہ میں ترکِ وطن کا ارادہ کر رہا ہوں، کیونکہ وطن کے اندر حالات سخت حوصلہ فرسا اور مایوس کن ہیں"۔

"کہاں جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں بھی، آسٹریلیا، جنوبی امریکہ، کنیڈا یا آپ کے وطن!"

یہ نوجوان ایرانی دل شکستہ تھا اور ایران میں ایسے بہت ملیں گے۔ بہت سے تو ترکِ وطن کر چکے ہیں اور بہت سے امید پر جی رہے ہیں۔ لیکن جو لوگ دوسرے ملکوں میں بس چکے ہیں وہ بھی منتظر ہیں کہ کوئی عوامی تحریک اُٹھے جس میں غیر ملکیوں کا ہاتھ نہ ہو تو وہ وطن واپس آ کر اس تحریک کو کامیاب بنانے میں اپنا فرض ادا کریں!

---


## "من و یزداں" کا پہلا حصہ

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دورِ تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ۔ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوعِ انسانی کو "انسانیت کبریٰ و اخوتِ عامہ" کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے اور جس میں مذاہب کی تخلیق، دینی عقاید، رسالت کے مفہوم اور صحائفِ مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشا اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے۔

ضخامت ۷۲۲ صفحات۔ مجلد۔ سات روپیہ آٹھ آنے (عہ) علاوہ محصول۔

## "من و یزداں" کا دوسرا حصہ

اس حصہ میں جن مسایل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے:۔

اصحابِ کہف ـــ معجزہ و کرامت ـــ انسان مجبور ہے یا مختار ـــ مذہب و عقل ـــ طوفانِ نوح۔ خضر کی حقیقت ـــ مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں ـــ یونس اور دہانِ ماہی ـــ حُسنِ یوسف کی داستان۔ قارون ـــ سامری ـــ علمِ غیب ـــ وحی کی حقیقت ـــ دُعا و توبہ ـــ لقمان ـــ عالمِ برزخ۔ یاجوج ماجوج ـــ ہاروت ماروت ـــ حوضِ کوثر ـــ نورِ محمدی اور پُل صراط ـــ آتشِ نمرود ـــ نفس و روح ـــ آدم اور شجرِ ممنوعہ ـــ لفظ اُمّی کا صحیح مفہوم ـــ معاد وغیرہ ـــ ضخامت ۲۲۴ صفحات کاغذ سفید و دبیز۔ قیمت علاوہ محصول پانچ روپیہ آٹھ آنے۔

**منیجر نگار۔ لکھنؤ**


---

# تیسرا باب

## (شہسواری کی طاقت)

ایران کے صوبۂ فارس میں ایک پہاڑی علاقہ کاشغئی قبیلے کا مسکن ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ (ایران کا نیپال) ہے، قبیلے کا خان یا سردار ناصر خان ہے جو جدید قسم کی تعلیم سے ناآشنا اور غیر ملکی زبانوں سے بالکل ناواقف ہے۔ اس کے تین بھائی اور ہیں۔ ایک بھائی حسین کاشغئی ایرانی مجلس کا ممبر ہے اور انگلستان و جرمنی کا تعلیم یافتہ ہے، انگریزی اور جرمن نہایت اچھی بولتا ہے۔ ایک ملاقات میں میں نے اس سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں شیراز جا رہا ہوں، چاہتا ہوں کہ ساتھ ہی کاشغئی علاقے کی سیاحت بھی کر سکوں۔ میں یہ سن چکا تھا کہ شاہ ایران کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی امریکن سیاح قبائلی علاقے میں جائے، اور شاہ نے یہ بات حسین اور دوسرے بھائیوں کے گوش گزار بھی کر دی تھی میں حسین کشغائی سے اس بات کی تصدیق بھی کر لینا چاہتا تھا کہ میرے دوران سفر میں سیاسی مداخلت تو نہیں کی جائے گی۔

حسین نے شاہ ایران کی نارضامندی کی پروا نہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا کہ "آپ کب جانا چاہتے ہیں آپ کے سفر کا سب انتظام ہو جائے گا۔" یہ امر واقعہ ہے کہ تہران اور فیروز آباد (کاشغئی نظام کے مرکز) کے درمیان کچھ اس قسم کی دشمنی ہے کہ وہ جب ضرورت سمجھیں ایک دوسرے سے بات چیت کر لیں اور جب بات چیت سے نتیجہ نہ نکلے تو توپ بندوق کی زبان میں گفتگو کرنے لگیں۔

اس قبیلے کو دبانے کی رضا شاہ نے انتہائی کوشش کی تھی۔ اس وقت ان بھائیوں کا باپ زندہ اور سردار قبیلہ تھا۔ اس کو اور بڑے بیٹے ناصر خاں کو جیل میں ڈال دیا تھا۔ باپ جیل میں مر بھی گیا۔ اور اس کے بھائی آج تک اس کا یقین رکھتے ہیں کہ ان کے باپ کو زہر دیا گیا تھا۔ اس کا بدلہ کاشغئی قبیلے نے ۱۹۴۶ء میں اس طرح لیا کہ بغاوت کی اور حکومت کی فوجوں کو زیر کر لیا۔ وجہ یہ تھی کہ صوبۂ فارس میں فوج کی تعداد زیادہ نہ تھی اور جتنی تھی وہ زیادہ طاقتور نہ تھی۔ "کاشغئی" بندر بوشہر اور خلیج فارس کا علاقہ

فتح کرکے شیراز پر بڑھنے والے تھے، مگر شیرازیوں کی الحاح وزاری پر رحم کرکے قبضہ اُٹھالیا۔
ایک ذمہ دار کاشغئی لیڈر نے بتایا کہ یہ جنگ اس مطالبے کے لئے کی گئی تھی کہ آذربیجانی باغیوں کا قلع قمع کیا جائے اور صوبۂ فارس میں کاشغئی قبیلے کو خاص رعایتیں دیجائیں۔ کاشغئی باغیوں کی ہر کامیابی سے نوجوان شاہ کو صدمہ ہونا قدرتی بات تھی۔ اور ایرانی فوج کے جرنیلوں کے لئے ذلت کا موجب تھا اسی لئے تازہ کمک بھیجی جارہی تھی اور ممکن تھا کہ باغیوں کی سرکوبی اسی طرح ہو سکتی —— مگر کسی خاص وجہ کی بنا پر ارباب حکومت نے مصالحت کرلینا ہی بہتر سمجھا۔
غرض، حسین کاشغئی نے ایک ذمہ دار آدمی میرے ساتھ کر دیا اور ہم فیروز آباد کے سفر پر روانہ ہوگئے پہاڑی راستہ دشوار گزار تھا۔ اور ہماری موٹر کو ایسے موقعے بھی پیش آئے کہ میرے رونگٹے کھڑے ہو ہوگئے جب میں فیروز آباد پہونچا تو محسوس ہوا کہ میں ہزاروں سال پہلے کی دُنیا میں پہونچ گیا ہوں اور جدید دُنیا خواب و خیال بن گئی ہے۔
یہ علاقہ سورج کی گرمی سے جھلسا ہوا بیابان ہے اور جہاں تہاں خیموں اور چھولداریوں کی بستیاں آباد ہیں۔ بھیڑوں کے گلّے ہیں اور یہی ان لوگوں کا ذریعہ معاش ہیں۔ اونچے پہاڑوں کے بیچ میں وسیع وادی کا یہ علاقہ، قبیلے کے بانی نے غالباً جنگی مصلحتوں کی بنا پر منتخب کیا ہوگا۔ اس علاقہ پر اچانک حملہ ہوجانا ناممکن ہے کاشغئی لوگوں کی تعداد دو لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ بلا کے جفاکش، بے مثل شہ سوار اور غضب کے نشانہ باز ہیں۔ ان کا رہنا سہنا خیموں کے اندر ہے اور قالینوں کا فرش ان کا انتہائی تعیش ہے۔ ان لوگوں کو قدامت سے عشق ہے اور جدید تمدن کی ہر چیز سے نفرت۔ یہ لوگ جتنے قدامت پرست ہیں اتنے ہی دلکش بھی ہیں۔ جس شدت کے ساتھ وہ بیرونی دنیا سے بیزار ہیں اتنے ہی اپنے عیبوں یا محاسن پر مُصر ہیں۔
جاڑوں کے موسم میں یہ لوگ اپنے اونٹوں، گدھوں اور بھیڑوں کو خلیج فارس کے علاقہ میں لے آتے ہیں اور گرمیوں میں شمالی علاقہ میں لے جاتے ہیں۔ گویا وہ باروں مہینے سورج کی روشنی میں رہنا چاہتے ہیں۔
میں نے جب پہلی بار، ان لوگوں کو اپنے تیز اور چنچل گھوڑوں پر سوار دیکھا تو مجھے خیال ہوا کہ یہ لوگ بنے ہی سپاہیانہ زندگی کے لئے ہیں۔ ہر چھوٹے بڑے کے کاندھے پر بندوق لٹکتی نظر آئی۔ قدرتی طور پر ہر کاشغئی اول نمبر کا شکاری ہے۔ ان کی شہسواری روسی کاسکوں کی یاد دلاتی ہے۔ ہر گھر میں کم سے کم ایک بندوق اور ایک گھوڑا ضرور ہونا چاہئے۔
ان لوگوں کی زبان فارسی نہیں بلکہ ترکی ہے۔ مگر ایران پرستی میں یہ لوگ اپنے تئیں کسی ایرانی سے کم نہیں ہیں، لیکن چونکہ یہ لوگ الگ تھلگ زندگی گزارتے ہیں اس لئے ایران کے لوگ ان کو برائے نام ایرانی

کہتے ہیں، اور اس سے کاشغئی خفا ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر حکومت تہران انھیں غیر مسلح کرنا چاہتی ہے، جس میں وہ کسی حد تک کامیاب ہو بھی چکی ہے مگر یہی بات اس کے لئے دردِ سر بھی بن گئی ہے۔

کاشغئی نہ تو وحشی ہیں اور نہ انھیں غیر مہذب کہا جا سکتا ہے۔ تعلیم بالکل نہیں لیکن حد درجہ متواضع و خلیق ہیں۔ بات بہت دھیمے لہجے میں کرتے ہیں جو متمدن سماج میں کمال شائستگی کا ثبوت سمجھی جاتی ہے۔

میرے لئے بڑے بھائی ناصر خاں کا مکان کھول دیا گیا۔ وہ خود تہران میں تھا۔ مگر کوئی تواضع ایسی نہ تھی جو اٹھا رکھی گئی ہو۔ یورپ کی شرابیں بھی فراہم تھیں۔

میں اکثر ان لوگوں کی خیموں کے کیمپوں میں چلا جاتا تھا۔ عورتیں غیر ملکیوں سے بھی پردہ نہیں کرتی ہیں اور ہر پہلو سے ان کو کامل آزادی حاصل ہے، وہ شہسواری بھی کرتی ہیں۔ البتہ خانگی مصروفیات کی بنا پر شکار کو نہیں جاتی ہیں، ان عورتوں کی خود اعتمادی انتہا کی ہے اور پوری مسلم دنیا میں اسکی مثال نہیں مل سکتی۔ ان لوگوں اور عام ایرانیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ کاشغئی تہذیب ایران کے گم شدہ تمدن کے صحیح نشانی ہے۔ میں نے ان کی عورتوں کی آزادی، خود اعتمادی اور مردوں سے مساوات دیکھ کر ایک کاشغئی سردار سے کہا:۔

"یقین نہیں آتا کہ یہ مسلم عورتیں ہیں!"

اس نے اپنی زبان میں میرا خیال ان عورتوں کو سنایا جو اس وقت وہاں موجود تھیں اور ایک شادی کی تقریب میں جمع ہوئی تھیں وہ سب قہقہہ مار کر ہنس دیں۔

کاشغئی اپنی دوسری مصروفیات کے ساتھ کٹر مسلمان بھی ہے اور یہ لوگ اپنے ایمان و عقیدہ کے لئے جان تک قربان کر سکتے ہیں۔ ان لوگوں نے اپنے یہاں مُلا کی دوکان نہیں لگنے دی، اسی لئے مذہبی تقشف ان میں نہیں پایا جاتا۔ کاشغئی لوگ عام طور پر پڑھ لکھ نہیں سکتے، مگر قرآن ضرور گردن میں حمایل ہوگا کیونکہ اس کی برکت سے بلائیں رد ہوتی ہیں۔ شراب بالکل نہیں پیتے۔

اسلام میں چار بیویاں تک جائز ہیں، مگر ان میں ایک سے زیادہ بیوی رکھنے والے شاذ ہوتے ہیں اور حقارت سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسلام میں عورت کا نکاح ثانی ہوتا ہے لیکن یہ لوگ اپنی لڑکیاں غیر کاشغئی سے نہیں بیاہتے کیونکہ وہ طلاق دے سکتا ہے اور یہ بڑی ذلت کی بات ہے۔ چنانچہ اس قوم میں طلاق بھی اتنی ہی شاذ ہے جتنی ایک سے زیادہ بیوی رکھنا۔ اس قبیلے کے سردار چار بھائی ہیں لیکن انہیں سے صرف ایک شادی کاشغئی عورت سے ہوئی ہے۔

لڑکی کی شادی بالعموم سولہ سال سے پہلے ہی کر دی جاتی ہے، مگر مرد شادی میں جلدی نہیں کرتے

کیونکہ یہ لوگ شادی کو ایک قسم کا قید و بند سمجھتے ہیں - ایک کاشغئی نے مجھے بتایا کہ :-
"آدمی یا تو بیوی کا انتخاب کرے یا بندوق کا"
ایک موقع پر میں اپنے کاشغئی رہنما کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک جگہ شادی کی تقریب نظر آئی - میرے ساتھی نے بلا محابا بھیڑ کے اوپر بندوق کے دو فیر کئے - میرے حواس گم ہو گئے - مگر میں نے دیکھا کہ وہ قہقہے لگا رہا تھا - خوشی کے موقعہ پر ان لوگوں میں بندوقیں داغی جاتی ہیں -
کاشغئی عورتیں بھی دوسری مشرقی عورتوں کی طرح شوخ رنگوں کو پسند کرتی ہیں اور اس کوہستانی پس منظر میں ان کے رنگ برنگ سر بند اور لباس بہت دلکش معلوم ہوتے ہیں -
سارے ایران میں کاشغئی لوگوں کی تندرستی بہترین ہے - یہ علاقہ ٹائیفائڈ، چیچک اور ملیریا کی بلا سے محفوظ ہے - دق کا مرض البتہ ہے جو وہاں کے جغرافیہ اور آب و ہوا کا نتیجہ ہے - ان لوگوں میں اعصابی اور دماغی مریض سنے نہیں گئے حالانکہ جدید تمدن میں ایسے مریض ہر جگہ ہوتے ہیں - ان لوگوں کی غذا سادہ ہوتی ہے - اور ان کی ضروریات محدود ہیں - چائے - شکر ان کی سب سے بڑی عشرت ہے جو مشکل ہی سے حاصل ہوتی ہے -
ایک کاشغئی خان سے میں نے پوچھا کہ کیا ان کے قبیلہ میں خودکشی کے واردات ہوتے ہیں ؟ وہ میرے سوال پر حیران رہ گیا اور بولا کوئی خودکشی کیوں کرتا ہے ؟ محبت میں ناکام رہنے یا زندگی کے ناقابل برداشت ہو جانے پر - ہمارے یہاں نہ تو پہلی صورت ہے نہ دوسری - اگر کوئی کاشغئی مصیبت میں پڑ جائے تو سب مل کر اس کی مدد کرتے ہیں اور اسے بھوکا نہیں مرنے دیتے - زندگی میں انتشار و بے حوصلگی مشینی تمدن کی خصوصیت ہے، مگر کاشغئی قوم اس سے متاثر نہیں اس لئے انتشار سے بھی واقف نہیں ہے"
اس قوم کی جنگجو یانہ مصروفیات کی بنا پر امریکن مشیر نے حکومت ایران کو مشورہ دیا تھا کہ انھیں چند روز کے لئے فوجی اسکول میں داخل کیا جائے - اس تجویز کی تہ میں یہ بات تھی کہ پہلے پولس اور پھر فوج میں کاشغئی لوگوں کا داخلہ قومی دفاع کو مضبوط بنائے گا - لیکن ایرانی جرنیلوں نے اس اسکیم کو خطرناک سمجھا کیونکہ کاشغئی قبیلہ خاص طور پر ناقابل اعتبار سمجھا جاتا ہے - لیکن یہ لوگ اپنی جگہ خود ایک فوج ہیں اور اپنی جنگی طاقت کو قایم رکھتے ہیں -
میرے قیام شیراز کے زمانہ میں، ایک نامور و قدیم خاندان کے فرد نے مجھے اپنے باغ میں چائے کی پارٹی دی - اس باغ کو دیکھ کر مجھے یقین کرنا پڑا کہ ایرانی اپنے باغات پر کیوں فخر و غرور کرتا ہے - یہ پارٹی نہایت پرلطف و دل خوش کن صحبت تھی - ایرانی قوم نہایت مہذب و شایستہ ہے، ان کی صحبت نہایت پرلطف

ان کا طرز ماند و بود نہایت نفیس، ان کی فطرت جمال پرستی اور گفتگو ذہین و ترنگ ہے! جب میں اس پارٹی سے واپس ہوا تو چند لوگ مجھے ہوٹل تک پہونچانے آئے۔ موٹر میں انھوں نے ذکر کیا کہ جلسہ سے چند گھنٹے قبل میزبان کے یہاں ڈاکہ پڑا تھا۔ لیکن میزبان نے مہمانوں کی دلداری کے خیال سے پارٹی کو ملتوی نہیں کیا۔ قبایلی لوگ ایسا اکثر کرتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں سے مجھے معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں نہ اسپتال ہیں نہ ڈاکٹر، نہ اسکول ہیں نہ ریڈیو۔ اور نہ کہیں سینما ہے۔ عام حالت یہ ہے کہ خوش حال کاشغئی معلم رکھ کر اپنے لڑکوں کو تعلیم دلاتے ہیں، لڑکیوں کے لئے تعلیم غیر ضروری سمجھی جاتی ہے۔ لیکن علم سے بے بہرہ ہونے کے باوجود کاشغئی بھی شاعری کے اتنے ہی شیدا ہیں جتنے دوسرے ایرانی۔ شاہنامہ ان کی مقبول کتاب ہے اور اس کے حصے جو شجاعت و قوم پرستی کے جذبات اُبھارتے ہیں، ہر کاشغئی کو زبانی یاد ہیں۔ ایک سال پہلے حکومت تہران کی فوجوں سے مقابلہ ہوا تھا تو کاشغئی عورتوں نے شاہنامہ کے اشعار سُنا سُنا کر کاشغئی جنگجویوں کو جنگ پر اُبھارا تھا۔

ایک انگریز مصنف نے لکھا ہے کہ:-

"ان لوگوں (کاشغیوں) کی رات جب اوپر چاند اور تارے چمکتے ہوتے ہوں اور نیچے ریگستان میں یہاں وہاں چولھوں کی آگ روشن، بڑا دلکش نظارہ ہوتا ہے۔ مجھ جیسے سیاح کے لئے ان لوگوں کی زندگی میں بڑی کشش پائی جاتی ہے، ایک آزاد زندگی، زمین سے محبت، فطرت سے قریبی تعلق، جدید تمدن کی اُلجھنوں سے بے تعلق، مختصر و سادہ ضرورتیں! کس قدر دلچسپ باتیں ہیں، لیکن آج کی دُنیا، سائنس اور مشین کی دُنیا، تمام اقوام کو متاثر کر رہی ہے اور کرتی رہے گی۔ آج بھی دُنیا میں زبردست قوم زیردست پر جبر و تشدد کر رہی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ کاشغئی اور ایران کے دوسرے قبایل کب تک الگ تھلگ رہ سکیں گے!

صحیح اعداد و شمار موجود نہیں مگر اندازہ کیا گیا ہے کہ ایران کی ایک کرور ساٹھ لاکھ کی آبادی میں تیس چالیس لاکھ کے درمیان قبایلی ہیں اور ان میں سے بہت تھوڑے لوگ متمدن و پُرامن زندگی کے راستے پر ڈالے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ اپنی خانہ بدوشی میں مست ہیں۔ آج حکومت اور قبایلیوں کے درمیان جنگ نہیں ہے، لیکن اسے امن کی حالت بھی نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ قبایلی ٹیکس ادا نہیں کرتے۔ یہ لوگ فوجی خدمت کے لئے نہایت مناسب ہیں لیکن حکومت ان پر اعتبار نہیں کرتی۔ ملک کے اندر رشوت کا بازار گرم ہے اور بیرونی طاقتیں بین الاقوامی ریشہ دوانیوں میں مصروف ہیں۔ اس لئے حکومت تہران کے خلاف ان قبایل کو بغاوت پر آمادہ کر لینا دشوار نہیں ہے۔

البتہ اعلیٰ تدبر کی پالیسی اس خلیج کو پاٹ سکتی ہے جو تہرانی حکومت اور قبایل کے درمیان حایل ہے

اگر ان کی جنگی اسپرٹ سے اپیل کی جائے تو قبائلی لوگ وفادار فوجی بن سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فوجی افسر اپنے ماتحتوں پر جبر کرنے اور ان سے رشوتیں لینا چھوڑ دیں۔

کاشغئی علاقے سے واپسی پر تہرآن میں میں نے پہلا کام یہ کیا کہ شیخ قبیلہ ناصر خاں سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ اپنے قبیلے کے مستقبل کے متعلق اس کا کیا خیال ہے تو اس نے جواب میں کہا کہ:

"آپ ہمارے علاقہ میں گھوم کر آئے ہیں، آپ نے دیکھا ہوگا کہ باقی تمام ایرانیوں کے مقابلے میں ہم لوگ بہتر زندگی گزار رہے ہیں، ہم آزاد ہیں، ہم نے اپنی عورتوں کو دبا کر نہیں رکھا ہے، ہماری صحت سارے ایرانیوں سے بہتر ہے۔ ہمیں نہ زمیندار کا ڈر ہے نہ جندرمہ کا خوف! جب ہمارا ملک ایرآن ترقی کی اس منزل پر پہونچے گا کہ تمام کاشتکاروں کے پاس فولادی ہل ہوں، دیہات میں بجلی پہونچ جائے، ڈاکٹر دستیاب ہونے لگیں، اسپتال کافی بن جائیں، لوگوں کے رہنے کو مناسب مکان ملیں، پینے کو صاف اور عمدہ پانی ملے اور پولس کے جبر و تشدد کا خاتمہ ہو، اس وقت کاشغئی خانہ بدوشی ترک کرنے پر سوچ سکے گا۔"

میں نے اسے توجہ دلائی کہ:-

"آپ مانیں گے کہ کاشغئی لوگ اس سے بہت زیادہ کر سکتے ہیں جتنا وہ کر رہے ہیں، اور ان کی بڑی قوت ضایع ہو رہی ہے، انھوں نے مویشیوں کے چرانے کے لئے لاکھوں ایکڑ آراضی کو چراگاہیں بنا رکھا ہے جہاں غلّہ، پھل اور ترکاریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح اس پر بھی غور کیجئے کہ صحیح علاج دستیاب نہ ہونے سے کتنے مویشی ضایع ہو جاتے ہیں!"

اس نے کہا:- "میں مانتا ہوں کہ مویشی کے علاج کے لئے ہم کو سلوتری میسر نہیں ہیں، اور نہ صرف جانور بلکہ معالجہ نہ ہونے سے آدمی بھی ضایع ہوتے ہیں، لیکن ہمارے علاقہ میں کوئی بھکاری تو نہیں ہے۔"

ناصر خاں کی دلیلیں پختہ ہیں اور جھٹلائی نہیں جا سکتیں۔ لیکن جس طرح امریکہ کے قدیم باشندے نئی زندگی میں کھپ گئے ہیں، اسی طرح ایک دن کاشغئی اور دوسرے ایرانی قبیلے بھی خانہ بدوشی کو خیرباد کہدیں گے۔

---


## مالہ و ماعلیہ

جوش، جگر، سیماب وغیرہ بڑے مشہور شاعر ہیں لیکن کبھی کبھی وہ بھی ایسی فاش غلطیاں کر جاتے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے۔ حضرت نیاز نے انھیں مشہور شاعروں کی بعض نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ فن شعر کتنا نازک فن ہے اور بڑے سے بڑا شاعر بھی کبھی کبھی اس میدان میں ٹھوکر کھا جاتا ہے۔ سرورق رنگین، قیمت دو روپیہ علاوہ محصول۔ **منیجر نگار**

# چوتھا باب

## (چاول کا گاؤں)

ایک یورپی مصنف جس نے کافی مدت ایران میں قیام کیا تھا، کہتا ہے کہ:-

"ایرانیوں کو خلق و تواضع کی تعلیم درکار نہیں، یہ وہ ماں کے پیٹ سے ساتھ لاتے ہیں۔"

میری ایرانی سیاحت میں اس قول کی تصدیق ہر جگہ ہوئی، ایک بار میں ایک نوجوان ایرانی کے ساتھ جو کیمبرج کا تعلیم یافتہ تھا، بحرِ قزوین (اسپین) کے ساحلی علاقے کی سیاحت کو گیا - یہ علاقہ گیلان کہلاتا ہے۔

ہم گاؤں میں داخل ہوئے تو ایک مکان کے سامنے دو نوجوان لڑکیاں دھان کوٹ رہی تھیں - ہمیں دیکھتے ہی ان لڑکیوں نے کام روک دیا - کپڑے جھاڑنے اور چہرہ صاف کرنے میں لگ گئیں، بالکل اسی طرح جس طرح یورپ کی کسی گاؤں کی لڑکیاں باہر کے لوگوں کے آجانے پر کرتی ہیں - سر کا رومال کھول کر جھاڑا اور پھر بال باندھ کر مسکراتے ہوئے ہمیں سلام کیا - پھر چند بچے بھی آگئے اور انھوں نے ہمیں گھیر لیا - ایسے صاف ستھرے بچے میں نے کسی ایرانی شہر میں نہیں دیکھے تھے - ان سب بچوں نے ہمیں سلام کیا - غیر لوگوں کے آجانے سے ان کو بھی اتنی ہی دلچسپی تھی جتنی یورپ کے بچوں کو ہو سکتی ہے - ان بچوں کی آنکھوں میں روشنی اور چہرے پر بشاشت تھی، اور اجنبیوں سے مطلق مرعوب نہیں تھے -

اس کے بعد ہی گھر کا مالک اندر سے باہر آیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن جھکائی اور اس طرح ایرانی تہذیب کے مطابق ہمارا خیر مقدم کیا - اس کے پیچھے پیچھے بچوں کی ماں تھی - اس نے بھی بڑی خندہ روئی اور سنجیدگی کے ساتھ رسم سلام ادا کی - اور فوراً دونوں لڑکیاں بھی آگئیں - اتنی دیر میں انھوں نے منھ ہاتھ دھو کر بال سنوار لئے تھے اور سر کے رومال خوبصورتی کے ساتھ باندھ لئے تھے - یہ لڑکیاں ایک کرسی لیکر آئیں - یہ کرسیاں گھر کے اندر استعمال نہیں ہوتیں بلکہ جب روضہ خوانی ہوتی ہے تو اس وقت کام آتی ہیں یا کوئی مہمان آجائے تو استعمال کی جاتی ہیں -

ماں نے چپکے سے ان لڑکیوں سے کچھ کہا اور وہ مسکراتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئیں۔ پھر واپس آکر مہمانوں کے سامنے ایک نے چھوٹی سی میز لگا دی اور دوسری نے چائے کی پیالیاں چن دیں۔ ہم مالک خانہ سے باتیں کر رہے تھے کہ اس کی بیوی اندر گئی اور ایک پلیٹ میں خربوزے کی قاشیں سجا کرلے آئی۔

اس قدیم رسم تواضع اور مہمانداری میں جذبات سے سوا بھی ایک بات ہے جو تخیل اور منطق پر مبنی ہو ساتھ کھانے پینے سے اجنبیت رفع ہو جاتی ہے، میزبان و مہمان کے درمیان ارتباط کی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ بحر قزوین کا یہ ساحلی علاقہ نہایت زرخیز ہے۔ پھل اور گھنے سایہ دار درخت بکثرت ہیں۔ مکان کے صحن کی دیوار مٹی کی تھی اور صحن کے اندر بھی متعدد درخت تھے۔ یہاں مکانات ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہیں بلکہ علحدہ علحدہ بنے ہیں اور درمیان میں درختوں کی آڑ بھی پائی جاتی ہے۔

یہاں میں نے جس قسم کے مکان دیکھے، ویسے "نیم مہذب ملکوں" میں کہیں نہیں دیکھے، عمارت کا سارا سامان مقامی پیداوار سے تعلق رکھتا ہے جو مفت یا بہت ارزاں مل جاتا ہے، یعنی مٹی، لکڑی اور پیال۔ ان دیہاتی انجینیروں کی تعمیری صلاحیت دیکھ کر، ایرانیوں کی تخلیقی محنت سے محبت کا مزید ثبوت ملتا ہے کہ افلاس اور جہالت کے باوجود اپنی ضرورت کی تمام چیزیں خود اپنے ہی ہاتھ سے بنالیتے ہیں

ان کے مکان دوہرے ہوتے ہیں، ایک حصہ گرمیوں کے اور دوسرا سردیوں کے استعمال کے لئے۔ سارے کام ایک بڑے کمرے میں ہوتے ہیں۔ دوسرا کمرہ بالعموم سامان رکھنے کے لئے ہوتا ہے۔ اسی کمرے میں کھانا پکتا ہے اور وہ دھوئیں سے کالا ہو جاتا ہے۔ میرے کہنے پر کہ دھواں آسانی سے نکالا جا سکتا ہے، بتایا گیا کہ دھواں قصداً مکان کے اندر رکھا جاتا ہے کیونکہ وہ چاول کی طیاری میں کام آتا ہے۔

بحر قزوین کا یہ علاقہ نہایت زرخیز ہے مگر ملیریا کا گھر ہے۔ مکانوں میں چٹائیوں اور قالینوں کے سوا اور کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ مجھے سارے ایران کی عورتوں سے زیادہ اس علاقے کی عورتوں نے متاثر کیا۔ گیلانی عورتیں پردہ نہیں کرتیں۔ ان کے دانت غیر معمولی طور پر سفید، آنکھیں بادامی، پلکیں دراز، پتلیاں نیلی ہیں اور ان میں سے نکلنے والی نظریں زندہ محسوس ہوتی ہیں۔ بال زیادہ تر سنہرے ہوتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان میں سے ہر ایک سلیقہ مند ہوتی ہے۔ انھیں اپنی شخصیت کا بھی پورا احساس ہے اور یہ سب خصوصیات کے ساتھ وہ مسلم عورتیں ہیں۔

کاشتکاری کا سارا بار گیلانی عورت کے کندھوں پر ہے۔ کاشتکاری کا سارا کام بہت پرانے ڈھنگ کا ہوتا ہے۔ ہل اب تک لکڑی کے ہیں۔ فصل کاٹ کر سروں پر اٹھا کر گھر لاتی ہیں۔ شاذونادر کسی کے پاس گھوڑا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں گاڑی ٹھیلہ کو کوئی نہیں جانتا۔

میں نے زمیندار کے کارندے سے سوال کیا کہ کیا اس علاقے میں ایک سے زیادہ نکاح کرنے کا رواج ہے تو اس نے بتایا کہ "ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کھیتی کے کام میں زیادہ سہولت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو البتہ وہ دوسری شادی کا خیال کر سکتا ہے۔"

میں نے سوال کیا کہ "اگر کوئی دوسرا نکاح کرے تو پہلی بیوی کیا کہتی ہے؟"

بولا:- "وہ کوشش تو یہی کرتی ہے کہ دوسرا نکاح نہ ہو، میکے بھی چلی جاتی ہے، لیکن پھر آجاتی ہے۔"

میرے اس سوال پر کہ طلاقیں بھی ہوتی ہیں، اس نے جواب دیا:-

"بہت کم، بات اصل یہ ہے کہ گیلانی عورت بہت کام کرتی ہے اس لئے مرد ایسی غلطی کرتا ہی نہیں مرد بہت نرمی برتتا ہے۔"

میرے میزبان نے مجھے بتایا کہ:-

"گیلان بھر میں ایسا گاؤں کوئی دوسرا نہیں ہے، مقابلتہً یہاں کے کسان خوش حال ہیں۔" اپنے قول کی تائید میں اس نے ایک کچی سڑک کی طرف اشارہ کیا جو گاؤں کو بڑی سڑک سے ملاتی تھی۔ یہ کچی سڑک پگڈنڈی سے ذرا چوڑی تھی، یہ گاؤں کسی موسم میں شہر سے کٹ کر علیحدہ نہیں ہو جاتا کیونکہ یہاں تک سڑک پائی جاتی ہے، اور آمد و رفت باروں مہینے جاری رہتی ہے۔ گیلان کے دوسرے گاؤں سڑک نہ ہونے کے باعث بعض موسم میں شہروں سے علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ پل نہ ہونے کے سبب سے جب ندیاں چڑھتی ہیں تو ذرائع آمد و رفت منقطع ہو جاتے ہیں اور اس زمانہ میں گاؤں والے طبی امداد اور معمولی دواؤں سے بھی محروم ہو جاتے ہیں۔

یہ سڑک اس گاؤں کے زمیندار نے بنوائی تھی اور اس وجہ سے لوگ اسے بہت اچھا سمجھتے تھے۔ اس سڑک کے علاوہ گاؤں والوں کی خوشحالی کا ثبوت ان کے لباس سے بھی ملتا تھا، چند بچوں کے سوا میں نے کسی کو ننگے پاؤں نہیں دیکھا۔

گیلان میں بٹائی کا طریقہ رائج ہے۔ لیکن فصل کا آدھا غلہ بٹنے کے علاوہ کسان کو کچھ دوسری رعایتیں بھی حاصل ہیں۔ گھر کے ساتھ ایک باغیچہ ہوتا ہے جس میں پھل اور ترکاریاں بوئی جاتی ہیں، ٹماٹر، کھیرے، خربوزے، لہسن، پیاز وغیرہ بوئے جاتے ہیں۔ اس کا لگان کچھ نہیں دینا پڑتا، پھر جنگلوں میں شکار بہت ہے اور کسان اپنی قرابین سے شکار کر لیتا ہے۔ کوئی ممانعت نہیں ہے۔

میں جس زمینداری میں گیا تھا اس کا مالک تہران میں رہتا ہے، میری ملاقات اس سے وہیں ہوئی۔ اور وہ پورے وسطی مشرق میں سب سے زیادہ رحمدل اور بامروت زمیندار سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے علاقے میں اکثر جاتا رہتا ہے اور اپنے پہونچنے کی اطلاع بازار میں نوٹس لگا کر دیتا ہے اور کسانوں کی فریاد بھی سنتا ہے

وہ انگریزی اور فرنیچ زبانیں بخوبی بولتا ہے۔ اس نے اپنی زمینداری میں پختہ عمارت بنواکر اسکول جاری کررکھا ہے جس میں پچاس بچے پڑھ رہے تھے۔

ایران کی زراعتی پستی موت کے پنجے کی طرح پورے ملک پر چھائی ہوئی ہے۔ اس خوش حال گاؤں میں بھی ہل تو بے شک جانور کھینچتے ہیں، باقی تمام کام صرف ہاتھ سے انجام پاتے ہیں۔ گیلان کا پورا علاقہ چاول کی کاشت کرتا ہے۔ ساری آبادی کا مدار چاول پر ہے۔ میرے سوال کرنے پر معلوم ہوا کہ اوسطاً ہر خاندان ڈھائی ایکڑ سے زیادہ کاشت نہیں کرتا کیونکہ دھان کی فصل بہت محنت چاہتی ہے۔ اس میں سے کسان کو آدھا چاول ملتا ہے جو تیس، چالیس "بوشل" کے درمیان ہوتا ہے۔ قرض ادا کرنے اور ضرورت کی چیزیں خریدنے کے بعد اُس کے پاس موسم بہار کے ختم ہونے سے پہلے غلہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ نیا قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے قرض کا سود دوگنا تک ہوتا ہے۔ اس مخصوص گاؤں کے بھی سب کسان مقروض تھے۔ اس گاؤں کے لوگوں کی خوش پوشاکی امریکہ سے آئے ہوئے پُرانے اور استعمالی کپڑوں کی بدولت تھی۔ اکثر ایرانی امریکہ کے ممنون ہیں کہ وہ انھیں کپڑا پہننے کے قابل تو کردیتا ہے۔ ایک کسان نے مجھ سے کہا کہ "سڑکیں نہ ہونا، قرض اور بخار ایران کی تین لعنتیں ہیں۔" خود اس گاؤں کے نوّے فیصدی باشندے ملیریا کا شکار تھے۔ اور ان میں صرف چند ایسے تھے جنھیں کونین نصیب تھی۔

اس علاقے کے جنگلوں میں خودرو پھلوں کی کثرت ہے۔ میرے سوال پر کہ لوگ ان پھلوں کا جام (مربّا) بناتے ہیں، جواب ملا کہ "شکر کہاں سے آئے؟ چائے کے لئے تو شکر میسر نہیں، جام کون بنائے؟"

یہ گاؤں مجھے ایسا بھایا کہ میں وہاں دوبارہ گیا۔ دوسری دفعہ میں اُس روز پہونچا جب وہاں ہاٹ لگ رہی تھی۔ آدمیوں کی ایک بڑی بھیڑ اکٹھا تھی اور ایک میلے کی سی صورت تھی، گو وہاں کھیل تماشے مطلق نہ تھے دوکانیں تھیں اور دوکانوں میں سامان تجارت تھا۔ بہت سے ایسے تھے جو بعض چیزیں خریدنا چاہتے تھے مگر خرید نہ سکتے تھے۔ لیکن سب خوش تھے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ انھیں افلاس کا ملال ہے نہ قرض کی فکر۔ نہ بخار سے پریشانی ہے نہ سڑک بننے کی آرزو۔ بس باہم ایک جگہ اکٹھا ہوجانا ہی ان کی مسرت کے لئے کافی ہے۔

میلوں میں لڑائی جھگڑا ہوجانا یورپ میں عام ہے، کیونکہ لوگ شراب کی بدمستی میں جھگڑ پڑتے ہیں لیکن چونکہ مسلمانوں میں شراب ممنوع ہے اور یہاں شراب کی کوئی دوکان بھی نہ تھی اس لئے یہاں کے میلہ میں میں نے لڑائی جھگڑا نہیں دیکھا، ان کی تنہا مسرت آپس کی بات چیت تھی یا پھر چائے کا دور۔ علاقہ کا زمیندار غیر معمولی طور پر بھلا آدمی تھا مگر اس کا کارندہ اس کا بالکل عکس تھا۔

اس علاقے کے لوگوں نے عمر میں ایک ہی دفعہ سینما دیکھا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب جنگ سے

زمانے میں برٹش قونصل کی طرف سے انتظام ہوا تھا۔ آس پاس کے کوئی تین ہزار آدمی جمع ہو گئے تھے۔ اس فلم کا چرچا وہاں آج بھی ہے۔ میں نے کچھ لوگوں سے سوال کیا کہ کیا وہ پھر سینما دیکھنا پسند کریں گے تو ایک نے جواب دیا کہ:

"کیا ہی اچھا ہو ——— مگر!"

"مگر کیا؟" میں نے کہا۔

"بعض شاید اسے پسند نہ کریں! کیونکہ سینما دیکھ کر ہم لوگ کچھ سیکھ جائیں گے!"

"وہ کون ہو سکتا ہے ——— کارندہ؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے ———"

"زمیندار؟" میں نے پھر کہا۔

"ہو سکتا ہے ———"

جس مکان میں ہم لوگ بیٹھے تھے، ایک پڑوسی یہ سن کر کہ کوئی امریکن آیا ہے، بے بلائے آ گیا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ کام کے علاوہ تفریح کی اور کیا صورتیں ہیں۔ تو اسنے برملا جواب دیا "بیماری!" اسنے تو یہ ہنس کر کہا مگر اس جواب کے اندر بڑی تلخ حقیقتیں پوشیدہ تھیں۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ وہاں کوئی گاڑی ٹھیلہ کیوں نہیں ہے ایک نے جواب دیا کہ:-

"آپ کی اطلاع غلط ہے: زمیندار کی موٹر پہیوں ہی پر چلتی ہے! اور شاید صرف اس لئے کہ وقت ضرورت وہ اس میں بیٹھ کر فرار ہو سکے!"

اس صحبت میں ایک ایسے زمیندار کے متعلق جس کی لوگ تعریف بھی کرتے ہوں، تیز تیز فقرے سنکر مجھے حیرت سی ہوئی۔ میرے ساتھی نے بتایا کہ:

"تودہ تحریک سے پہلے یہ لوگ ایسی باتیں کرنا جانتے بھی نہ تھے"۔

تودہ تحریک ختم کر دی گئی لیکن لوگوں کو بے چین ضرور بنا گئی ہے۔ کوئی دہقان اقرار نہیں کرے گا کہ اسے تودہ پارٹی سے تعلق ہے یا وہ ایسے خیالات رکھتا ہے کیونکہ ہر آدمی کارندے سے ڈرتا ہے۔ اور تودہ کا نام لینا بھی خطرہ کی بات تھی۔

زمیندار کا کارندہ بہت زیادتیاں کرتا تھا، اور اگر زمیندار کے علم میں یہ باتیں آ بھی جاتی تھیں تو وہ ڈانٹ ڈپٹ سے زیادہ کچھ نہیں کہتا تھا۔ کیونکہ کارندے کی سخت گیری وصولیابی کی ضامن تھی۔ اس گاؤں میں کارندے کی شکایت کرنے کی کسی کو ہمت ہو ہی نہ سکتی تھی کیونکہ شکایت کا بدلا بہت سخت ہوتا

تھا۔ پانی بند کر دینا تو پہلی سزا تھی۔ اس لئے لوگ اسی میں عافیت سمجھتے تھے کہ کارندے سے بگاڑ نہ کریں۔

تودہ تحریک کے مطالبوں میں پہلا یہ تھا کہ کاشتکار کا حصہ زیادہ ہونا چاہئے۔ طبی امداد اور تعلیم عام اور مفت ہو، سب کو روزگار دیا جائے، اور جندرمہ کو موقوف کر دیا جائے۔ اس آواز نے ایرانی خاصکر گیلانی کسان کی روح کو جگا دیا ہے۔

تہرانی حکومت نے غفلت نہیں کی اور کسانوں کا حصہ زیادہ ہونے کا اعلان کر دیا۔ اگرچہ سارے زمینداروں نے اس حکم پر عمل نہیں کیا۔

میرے ساتھی نے بتایا کہ:۔

" ہمارے علاقے میں چاول، چائے، تمباکو، جوٹ اور ریشم کی قیمتی پیداوار ہوتی ہے۔ اور ہم اس کو بڑھا بھی سکتے ہیں۔ آراضی کی استعداد بھی بہت بڑھائی جا سکتی ہے۔ لیکن زمینداروں کو پروا نہیں اور کسان میں اپج نہیں۔ چاول کی کاشت میں مشینوں سے اسی طرح کام لیا جا سکتا ہے۔ جیسے آپ امریکہ میں لیتے ہیں۔ لیکن ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ ہم ملیریا کو بھی ناپید کر سکتے ہیں لیکن نہیں کر سکتے!"

حکومت کے پاس پیسہ نہیں اور کسان قلاش ہے اور زمیندار اپنی دولت غیر ملکوں میں عیاشی کی زندگی بسر کرنے میں خرچ کر رہا ہے!"

" اس کا حل کیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

اس نے جواب دیا " کون بتائے؟"

---


# جمالستان

(تازہ اڈیشن)

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، قدرت بیان اور پاکیزگی خیال کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشری مسایل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ اور ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں متعدد افسانی اضافے کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے۔ قیمت پانچ روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

# پانچواں باب

## (ابر آلود مطلع)

ایرانی آذربیجان کا مستقر تبریز ہے اور دوسرا بڑا اور اہم شہر ہے۔ میری تبریز کی سیاحت نہایت تازگی بخش ثابت ہوئی۔ وسطِ گرما میں تبریز کا موسم تہران سے زیادہ خوشگوار تھا، ہوائی جہاز سے اُترتے ہی پہاڑوں کی خنک و خوشگوار ہوا کے مسلسل جھونکے ایک بہشتی تحفہ معلوم ہوتے تھے۔ آفتاب کی حرارت طہران کی طرح تیز نہ تھی۔ شمالی ایران میں سفر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ آذربیجان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی ایرانیوں اور آذربیجانیوں کا فرق محسوس ہوا۔ آذربیجانی صرف نسلی اعتبار ہی سے نہیں بلکہ جسمانی ساخت میں بھی ایرانیوں سے مختلف ہیں۔ انکا قد دراز، جسم بھاری اور رنگ کھلتا ہوا ہے۔ وہ زیادہ جفاکش اور زیادہ سنجیدہ ہوتے ہیں۔ روسی اور ایرانی آذربیجان کے لوگ ہم نسل و ہم زبان ہیں۔ دونوں علاقے ترکی بولتے ہیں۔ اندازِ کلام میں سنجیدگی، حرکات میں سہولت پائی جاتی ہے اور آسانی سے ہنس دیتے ہیں۔

لیکن باوجود اس اختلاف کے آذربیجانی ایرانیوں سے کم متواضع نہیں ہیں۔ مینے ایک سنیما میں دیکھا کہ فلم کے گانے کے ساتھ تماشائی خود بھی گانے لگے۔ بازاروں کا گشت کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چائے خانوں میں بیٹھے ہوئے لوگ گا رہے ہیں۔ آذربیجانی بھی ایرانیوں کی طرح شاعری کے شیدا ہیں۔ ان کے مقبول و ممتاز شاعر فضلی بغدادی اور حاج رضا اشرف ہیں۔

آذربیجان کے لوگ خوددار بہت ہیں۔ حد یہ ہے کہ ایک آذربیجانی گداگر غیر آذربیجانی سے کبھی بھیک نہ لیگا۔ ایران کے مشنری ادارے تبریز میں بھی کام کر رہے ہیں اور یہ حقیقت ماننا پڑے گی کہ مشنریوں نے آذربیجان کے سماجی سدھار میں بڑی خدمت کی ہے۔ تہران میں ایک تعلیم یافتہ خاتون نے مجھ سے کہا کہ "آپ کی مشنری ہماری روحانی نجات، کے لئے آئے تھے لیکن انھوں نے ہماری مادی بہبودی کا کام بھی کیا ہے۔" امریکن اور برٹش مشن مسلمانوں کو عیسائی بنانے میں تو کامیاب نہیں ہوئے لیکن تعلیم پھیلانے میں انھوں نے بہت کامیابی حاصل کی

۱۹۳۹ء میں رضا شاہ نے ان مشنریوں کو ممنوع قرار دے دیا، حالانکہ تعلیم یافتہ ایرانیوں کو اقرار تھا کہ مشنری تعلیم گاہوں کے مقابلے میں ایرانی تعلیم گاہیں ہیچ تھیں۔ چنانچہ مشنری اسکولوں اور کالجوں کے بند ہو جانے سے ایران کو سخت نقصان پہونچا اور روشن خیال ایرانی اس پر متاسف ہیں۔

تبریز میں پرسبیٹیریان مشن اسپتال سارے آذربیجان مشہور ہے۔ اس اسپتال کا بڑا ڈاکٹر، ڈاکٹر چارلس لام ہے۔ یہ ۱۹۱۳ء میں آذربیجان آیا تھا۔ اُسے مقامی زبان پر پورا عبور حاصل ہے۔ سارے آذربیجان کے علاوہ ایک طرف گیلان اور دوسری طرف کردستان کے ملحقہ علاقوں سے بھی مریض آتے ہیں۔ ڈاکٹر لام نے نرسوں کی ٹریننگ کا بھی ایک اسکول جاری کر رکھا ہے اس اسکول سے ٹریننگ پائی ہوئی نرسیں اور دائیاں سارے ایرانی اسپتالوں میں کام کر رہی ہیں۔ جب یہ اسکول جاری ہوا تو مسلم ماں باپ نے اپنی بچیوں کے لئے غیر مذہب والوں سے میل جول بڑھانا اور نرس بنکر رات رات بھر گھر سے غیر حاضر رہنا، اچھا نہیں سمجھا۔ لیکن ڈاکٹر لام کی ہر دل عزیزی نے اس مورچے کو آسانی سے فتح کر لیا اور یہ مخالفت زیادہ دن قایم نہ رہ سکی۔

چونتیس برس کی جانفشانی کے بعد بھی ڈاکٹر لام آذربیجانیوں کی صحت میں نمایاں بہتری پیدا نہیں کر سکا، اس لئے کہ پانی کی بہم رسانی حفظان صحت کے اصول پر نہیں ہے اور کلوریم ڈالنے کی مشین کہیں نہیں ہے۔ زمین دوز بدر رو بنانے کا خیال تک نہیں کیا گیا اور پبلک حمام جہاں تمام لوگ ایک ہی حوض میں غسل کرتے ہیں، متعدی امراض کو پھیلاتے رہتے ہیں۔ خاص طور سے چیچک، ٹائیفائڈ اور آنکھوں کی بیماریاں عام ہیں لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ وہ لال دوا سے پھل اور ترکاریاں دھو لیا کریں تو وہ کہتے ہیں مزا خراب ہو جائے گا۔

ایرانیوں کی طرح آذربیجانی بھی اعلیٰ درجے کے دستکار ہیں، قالین بافی، چاندی سونے کا کام اور چمڑے کی دستکاریوں میں صناع کا درجہ رکھتے ہیں۔ البتہ انھیں ایرانیوں کی طرح باغ لگانے کا ذوق نہیں ہے۔ تبریز کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے مگر ایک قصبہ معلوم ہوتا ہے، حالانکہ ایک نسل پہلے تک بڑی تجارتی منڈی تھا۔ شہر میں رونق و خوبصورتی یا جدید تمدن کا نشان نہیں، سارے شہر میں صرف ایک لائبریری ہے، کل ۴۴۰ ٹیلیفون ہیں، ایک روزانہ اخبار ہے جس کی اشاعت پوری ہزار بھی نہیں، دوسرا سہ روزہ ہے، اس کی اشاعت اتنی بھی نہیں ہے، ایک تیسرا اخبار بھی نکلتا ہے جس کی اشاعت کا کوئی وقت ہی نہیں ہے، غرض پورا علاقہ تو کیا، شہر میں بھی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی ہے۔

زار شاہی زمانہ ہی سے تبریز ایک مفصلاتی شہر رہا ہے جس کی ہر چیز چیخوف کے ناولوں کا زمانہ اور اسکے

مناظر پیش کرتی ہے۔ یہاں کھانے بھی روسی قسم کے زیادہ پسند کئے جاتے ہیں کیونکہ سلافی لوگ ہمسایہ ہیں۔ عام طور سے روسی زبان بولی سمجھی جاتی ہے۔ روس کا یہ اثر تعجب کی بات بھی نہیں جغرافیائی قربت ہونیکے ساتھ تجارتی تعلقات بھی گہرے رہے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود جب غور سے دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ آذربیجان بنیادی طور پر ایرانی ہی ہے، بازار سارے مسقف ہیں، دستکاریاں بھی تمام ایرانی ہیں، اہل حرفہ کے اوزار بھی وہی ہیں —— اور رہنے سہنے کے طریقے بھی ایرانی ہیں۔

تبریز میں مجھے سب سے زیادہ حیرتناک بات یہ نظر آئی کہ وہاں کی مسلم عورتیں حد درجہ شریف و محتاط ہیں۔ رضا شاہ نے پردہ ترک کرادیا تھا مگر تبریزی عورتوں نے پھر اختیار کرلیا ہے، ان کی چادر (یا برقعہ) سیاہ ہوتی ہے اور ان سیاہ پوش عورتوں کی وجہ سے بازار ماتم خانہ معلوم ہوتے ہیں۔ ایک پردہ ہی نہیں اور بہت سی پرانی رسمیں جو حکماً ترک کرادی گئی تھیں پھر اختیار کرلی گئی ہیں، رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دوکانیں خواہ وہ غیر مسلموں کی ہی ہوں بند رکھی جاتی ہیں۔

جنگ ختم ہونے کے بعد سے چونکہ ایرانی حکومت بین الاقوامی معاملات میں زیادہ الجھی رہی اس لئے ملاؤں کو قدامت پرستی اور مذہبی تنگ خیالی کی تبلیغ کرنے کا کافی موقعہ ملا ہے۔ ملاؤں کی یہ تحریک شروع میں خفیہ رہی مگر چونکہ نوّے فیصدی آبادی جاہل ہے اس لئے ملاؤں کی مذہبی تحریک زور پکڑ گئی ہے عورتوں میں جتنی جہالت زیادہ ہے، یہ تحریک ان میں اتنی ہی زیادہ تیزی سے مقبول ہوئی ہے، حد یہ ہے کہ فیکٹری کے مزدور بھی اس سے متاثر ہیں۔

میرے قیام اصفہان کے زمانہ میں پارچہ بافی کے ایک کارخانہ کے مزدوروں نے ایک ایسے مزدور کو برطرف کردینے کا مطالبہ کیا جس نے دوسرا مذہب اختیار کرلیا تھا، اور مل کے ذمہ دار اس مطالبہ کو مان لینے کو طیار بھی ہوگئے تھے، مگر ایران کی مشنریوں نے احتجاج کیا اور کہا کہ یہ مذہبی اقلیتوں کے حقوق پر دست درازی کا مترادف ہوگا، اس لئے مقامی حکام نے اس مطالبے کو رد کرادیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ شیراز کے قریب ایک گاؤں میں ہوا تھا جہاں عیسائیوں کے دس خاندان بستے تھے ملاؤں کے ورغلانے پر کچھ مسلمان لاریوں پر سوار ہوکر وہاں پہونچے اور رات میں عیسائی گھروں پر ہلہ بول دینا چاہتے تھے مگر وہاں کے مکھیا اور مسلم آبادی نے عیسائیوں کی حمایت کی۔

ایرانی آذربیجان کا دوسرا بڑا شہر رضائیہ ہے۔ جب سنہ ۱۹۴۶ء میں آذربیجان کی نئی خود مختار حکومت ختم کردی گئی تو اس وقت بعض مسلم مذہبی دیوانوں نے عیسائیوں کے چار گاؤں کو آگ لگادی اور بعض گاؤں

میں مال بھی لوٹا - ان علاقوں کے بعض عیسائی لیڈروں نے مجھے بتایا کہ ان حالات سے مجبور ہو کر وہاں کے عیسائیوں نے ہجرت کرنے کا تہیہ کر لیا تھا اور انھیں توقع تھی کہ امریکہ و برطانیہ میں انھیں پناہ مل جائے گی یہ مذہبی دیوانگی تہران کی پرانی آبادی میں زیادہ تھی جہاں زیادہ مزدور اور چھوٹے دوکاندار رہتے ہیں، میں نے خود بھی دیواروں پر ایسے پوسٹر لگے دیکھے جن میں بے نقاب عورتوں کو اہانت آمیز لفظوں سے مخاطب کیا گیا تھا - بعض دوکاندار تو عریاں چہرہ والی عورت کو "ننگی" کہتے اور ان کے ہاتھ سودا بیچنے سے انکار کر دیتے تھے - بے نقاب عورتوں کو بازاروں کی مسجدوں سے نکالا بھی گیا -

مگر اسی کے ساتھ روشن خیال مذہبی پیشوا جو تمام مسلم ممالک میں سب سے زیادہ ترقی پسند ہیں، ایسے متعصب اور مجنون ملاؤں سے اتنے ہی بیزار ہیں جتنا ایران کا تعلیم یافتہ طبقہ خفا ہے - ان بالغ نظر ایرانیوں کو یقین ہے کہ ان ملاؤں کی ہمت افزائی اوپر سے ہو رہی ہے -

مذہبی تعصب کی تبلیغ کا اثر اس حد تک ہوا کہ ایک فوجی افسر جس نے ہٹلر کی جرمنی میں تعلیم پائی ہے، ایران کی معاشرتی خرابیوں اور فوجی کمزوریوں کا افسوس کے ساتھ اعتراف کرتے ہوئے مجھ سے کہنے لگا کہ:

"اپنی حفاظت کے لئے ہمارے پاس ایک ہی ہتھیار ہے اور وہ مذہبی تعصب ہے، ہمیں اس ہتھیار کو تیز رکھنا چاہئے، ہو سکتا ہے کہ یہ اسکی ذاتی رائے ہو، اور ممکن ہے کہ یہ کوئی طے شدہ پالیسی ہو، مگر مجھے جتنے تعلیم یافتہ اور روشن خیال ایرانیوں سے تبادلۂ خیال کا موقعہ ملا وہ سب اس خیال پر ہنستے تھے -

ایرانی ملاؤں کو مذہبی منافرت پھیلانے میں جو کامیابی آذربیجان اور خاص کر تبریز میں ہوئی وہ ایران کے دوسرے علاقوں میں نہیں ہوئی - ، یہ علاقہ پینتالیس لاکھ آبادی کا علاقہ ہے جہاں کسانوں کی اکثریت اپنی زمین کی خود مالک ہے - جھیل ارمیا اسی علاقے میں ہے جو اسّی میل لانبی اور کم و بیش پچیس میل چوڑی ہے اس علاقہ میں پانی بافراط ہے - پہاڑی ندیاں علاقے کو بخوبی شاداب رکھتی ہیں اور زیر زمین بھی پانی کی کمی نہیں - بعض جگہ نو دس فٹ پر پانی نکل آتا ہے - اس شادابی کا نتیجہ ہے کہ یہ علاقہ پورے ایران کے لئے غلہ فراہم کرتا ہے، انگور کشمش اور خوبانیاں بکثرت ہوتی ہیں - ایسی ناسپاتیاں میں نے سارے ایران میں کہیں نہیں دیکھیں - ترکاریاں بھی ہر قسم کی بکثرت پیدا ہوتی ہیں -

ایسا ہوتے ہوئے بھی آذربیجان کی زراعت اور دیہی زندگی المناک نقشہ پیش کرتی ہو ذریعہ رسل و رسایل محدود اور مال کی آمد و رفت برائے نام ہے - ٹریکٹر کو یہاں کوئی جانتا ہی نہیں اور موٹر شیڈ شاذ ہی دیکھا جاتا ہے - قصبہ خوش میں میں نے البتہ ناج پھٹکنے کی ملیں دیکھیں مگر وہ بھی روسی ساخت کی تھیں - باغوں میں درختوں کی کاٹ چھانٹ بہت کم ہوتی ہے - بہترین پھل کیڑے مکوڑوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دئے جاتے ہیں -

پھل ہاتھوں سے نہیں توڑے جاتے بلکہ درخت کو ہلا کر گرا دیئے جاتے ہیں جو زخمی ہو کر جلد خراب ہو جاتے ہیں۔ اس علاقے میں فصل پانچ حصوں میں بانٹی جاتی ہے۔ ایک حصّہ زمین کا، دوسرا پانی کا، تیسرا بیج کا، چوتھا بیل کا اور پانچواں کسان کا۔ جس کسان کے پاس اپنا ہل ہے وہ تو چالیس فیصدی پا لیتا ہے ورنہ بیس فیصدی ہی پر قناعت کرنا پڑتی ہے۔ بیج اسے بالعموم زمیندار ہی سے لینا پڑتا ہے کیونکہ اپنا غلّہ تو وہ کھا چکتا ہے۔ الحاصل وہاں کی زراعت جہاں ہزار سال پہلے تھی وہیں آج بھی ہے اور اس نہایت زرخیز علاقے کا کسان بدستور افلاس زدہ ہے۔

حکومت ایران نے حکم جاری کر دیا ہے کہ خود مختار حکومت کے زمانے کا بقایا لگان وصول نہیں کیا جائیگا۔ مگر زمیندار جو اس زمانہ میں وہاں سے بھاگے ہوئے تھے اب واپس پہونچ کر وصول کر رہے ہیں۔ حالانکہ کسان نے وہ لگان اس حکومت کو ادا کر دیا تھا۔

زمیندار کے ساتھ جندارمہ (پولس) بھی پھر نمودار ہو گئی۔ یہ دونوں کسان کے لئے وباء کا درجہ رکھتے ہیں۔ خود مختار حکومت قایم ہو جانے کی اہمیت کو زمیندار نے محسوس نہیں کیا تو جندارمہ کیا کرتی جو زمیندار سے رشوت پاکر بقایا وصول کرا رہی تھی۔ ایک امریکن ڈپلومیٹ موٹر سے آذربیجان کا سفر کر رہا تھا۔ اسے ایک رات کسی کسان کے گھر ٹھہرنا پڑا۔ جہاں اُسے معلوم ہوا کہ چند روز پہلے ایک جندرمہ کا سپاہی اسی گھر میں ٹھہر چکا تھا اور غریب کسان نے حد سے زیادہ تواضع بھی کی تھی، لیکن چلتے وقت اس سپاہی نے دو سو ریال طلب کئے جو غریب کسان کے لئے بڑی دولت کا درجہ رکھتے تھے۔ لیکن سپاہی کے جبر و تشدد کے سامنے کسان کو یہ رقم ادا کرنا ہی پڑی۔ زمیندار و جندارمہ کی سختیوں سے کسانوں میں بے چینی ہے اور باغی جماعت اس بے چینی کو ہوا دے رہی ہے۔ ایک ایرانی مصنف نے مجھ سے کہا کہ:

"ہمارا ملک اس آدمی کی طرح ہے جو سونے کے تخت پر بیٹھا ہو مگر بھوکا ہو!"

بلاشبہ آذربیجان کی حالت اس قول کی شرح و تفسیر ہے۔ جدید آلات سے کام لیا جائے تو یہ علاقہ فی الواقعی سونا اُگلے۔ لیکن زمیندار ترقی کرنے کی خاطر روپیہ لگائے اور بغاوت ہو جائے تو اس کی دولت تو گئی! یہ خطرہ ہر وقت زمیندار کے سامنے ہے۔ اس لئے وہ تہران میں بیٹھا چین کر رہا ہے۔

---


## مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا۔ اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

# چھٹا باب

## (مرکزِ طوفان)

سنہ ۴۶ء میں تبریز، ایشیا کا مرکزِ طوفان تھا اور دنیا کی نظریں وہاں کے واقعات پر لگی ہوئی تھیں۔ خاص طور پر لندن و واشنگٹن میں یہ خطرہ زیادہ محسوس کیا جا رہا تھا اور ماسکو میں امیدیں قایم ہو رہی تھیں۔ اس طوفان کے بادل اکٹھا ہونے میں وقت زیادہ لگا۔ یہ رضا شاہ ہی کے وقت سے اکٹھا ہونا شروع ہو گئے تھے، کیونکہ رضا شاہ نے اصلاحات جاری کر لینے کے ساتھ آزادی کی خواہش کا بھی گلہ دبایا۔ لیکن نئی سڑکوں کی تعمیر، ریلوے کا اجراء، اور نئی فیکٹریاں قایم ہونا، ایک نئی سماجی طاقت کو وجود میں لانے والے اسباب تھے، یہ نئی سماجی طاقت "مزدور" کی ہے! ان تمام کاموں کے جاری ہونے سے مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ رضا شاہ مزدور تنظیم کا زبردست دشمن تھا، اسے لفظ WORKER سے چڑھ تھی۔ اس کے لئے اس نے LABOURER کا لفظ اختیار کیا۔ مزدور سنگٹھن، رضا شاہ کے استبداد کے لئے ایک چیلنج تھا اس لئے وہ اس تحریک کا دشمن تھا۔ رضا شاہ کو روس اور بالشویک تحریک سے بھی سخت نفرت تھی۔ شاید اس لئے کہ روس WORKER کے لفظ پر مصر اور اسے اعلیٰ صفات کا مجسمہ اور نوع انسان کا نجات دہندہ باور کرتا ہے۔

رضا شاہ کی یہ نفرت اس وقت اور شدید ہو گئی جب اسے گیلان کے بالشویک لیڈر مرزا کچک خاں سے واسطہ پڑا۔ آذربیجان کی خود مختار حکومت کا سرخیل مرزا کچک تھا اور اس نے اپنی حکومت کے دنوں میں "ورکر" اور "پرولتاریہ" لفظوں کی زبردست اشاعت و تبلیغ کی تھی۔ لیکن بالآخر رضا شاہ مزدوروں کی بعض خفیہ جماعتوں کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر اس جبر و استبداد کا یہ نتیجہ نکلا کہ سوشلسٹ، کمیونسٹ اور تعلیم یافتہ طبقوں کے ساتھ مزدور اور لبرل جماعتیں بھی متحد ہو گئیں اور ان سب کی ایک خفیہ جماعت بن گئی تاکہ رضا شاہی استبداد کا مقابلہ کیا جائے۔ سنہ ۴۳ء میں اس جماعت

کے ترپین ممبر پکڑ کر جیل میں ڈال دئے گئے اور کچھ دوسروں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ اس تحریک کے لیڈر تقی ایرانی کو قصر قاچار جیل میں کوئی مہلک انجیکشن دیکر مار دیا گیا۔

اگست ۱۹۴۱ء میں روسی اور برٹش فوجیں ایران میں داخل ہوئیں اور جب رضا شاہ معزول ہو کر جلا وطن ہوئے تو سارے سیاسی قیدی بھی رہا ہوئے۔ جعفر پشواری دس سال سے جیل میں تھا، وہ بھی رہا ہوا۔ بعد میں اس نے آذر بیجانی بغاوت کی رہنمائی کی۔ پشواری جرمنی اور فاشزم کا زبردست مخالف ہے۔ رہائی کے بعد اس نے تودہ پارٹی قایم کی اور مردم اخبار بھی نکالا جو جرمنی کے طرفدار ایرانیوں کے خلاف لکھتا رہا۔ تودہ پارٹی میں ہر ایرانی ممبر ہو سکتا تھا مگر جو لوگ رضا شاہ کے ہوا خواہ رہے تھے ان کو ممبر نہیں بنایا جاتا تھا۔

اکتوبر ۱۹۴۲ء میں اس پارٹی نے ٹریڈ یونین کی بنا ڈالی۔ ۱۹۴۵ء کے آخر تک پورے ایران میں مزدور تحریک کا ایک مضبوط نظام قایم ہو گیا۔ جس کی رہنمائی "فیڈریشن آف دی ٹریڈ یونین آف ایران" کے ہاتھ میں تھی۔ ایران میں مزدوروں کی گنتی زیادہ نہیں مگر تودہ پارٹی کی سیادت میں تنظیم اتنی صحیح تھی کہ یہ تحریک ایک طاقت بن گئی۔ کارخانہ دار، زمیندار اور حکومت، سب ڈرنے لگے۔ اصفہان کی ملوں اور انیگلو ایرانین آیل کمپنی کی کامیاب ہرتالوں سے پورا اندیشہ ہو گیا تھا کہ ایک روز ملک کی حکومت پر یہ جماعت قابض ہو جائے گی۔ چنانچہ اس کے خلاف ہر قسم کی کارروائیاں شروع ہو گئیں۔ اس تحریک میں سارے کے سارے کمیونسٹ نہ تھے مگر انھیں کمیونسٹ کہکر اور روسی تحریک نام دیکر بدنام کیا گیا۔ آذر بیجان کی خود مختار حکومت میں صنعت و تجارت کا وزیر ایرج اسکندری ایک عالی خاندان شخص تھا، مگر تودہ پارٹی کا سخت دشمن بھی اسکندری پر یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ وہ غدار ملک یا کسی بیرونی طاقت کا آدمی تھا، حالانکہ اسکندری آج جلا وطنی کی حالت میں یورپ میں پڑا ہوا ہے۔ وہ ایک ممتاز قانون داں اور نہایت خوش بیان مقرر ہے۔ اس کے سیاسی عقاید سوشلزم کے ہیں۔ وہ زمین کی مساویانہ تقسیم فوراً کرنا چاہتا تھا مگر زمینداروں کو معاوضہ دیکر اُسے اس بات کا یقین تھا کہ اگر کسان کو زمین کا مالک بنا دیا جائے اور اسے مشینی امداد دیجائے تو ایران ارتقائی اصول پر ترقی کر کے متمدن ملکوں کے دوش بدوش ہو سکتا ہے۔ مگر اس کی یہ اسکیم جس میں نہ خون خرابے کا اندیشہ تھا، نہ ڈکٹیٹری کا اور نہ بیرونی طاقتوں کے نفوذ و اثر کا، انقلابی اسکیم کہہ کر دبا دی گئی۔

انتخاب میں پشواری، مزدوروں کے ووٹ سے مجلس کا ممبر چنا گیا مگر جب مجلس نے اس کے انتخاب کو مسترد کر دیا، تو اس نے آذر بیجان جا کر ایک اور پارٹی "ڈیماکریٹک" کے نام سے بنالی۔ اہلِ ایران کا خیال ہے کہ پشواری ایسا نہ کرتا تو تودہ پارٹی ایک طاقت بنی رہتی۔ ۱۹۴۶ء کے الیکشن میں تودہ پارٹی کو خاص کامیابی ہوئی اور کیبنٹ میں اس کے تین ممبر لئے گئے تو بحران کی صورت پیدا ہو گئی۔ تعلیم، صحت اور صنعت و تجارت کی وزارتیں تودہ پارٹی

کے ہاتھ میں تھیں جن میں ایک اسکندری تھا۔

ایران کی تاریخ میں "لیبرلا" کا تخیل ہی بالکل نئی چیز تھا۔ تودہ کا نام لوگوں کے دلوں میں امنگ پیدا کر دیتا تھا اور لوگ اس خیال سے خوش تھے کہ ہزاروں برس کی پرانی شاہنشاہیت ختم ہو کر ترقی پسند جمہوریت قایم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ ایرانی عوام کی تودہ تحریک نے جو بیداری اور حرکت پیدا کر دی تھی، اس کا اعتراف ہر حلقے میں کیا جاتا تھا۔ لیکن تبریز کے واقعہ نے اس تحریک کو نہ صرف آذربیجان میں بلکہ پورے ایران میں ختم کر دیا۔ تبریز کی خود مختار حکومت کا بننا اور بگڑنا ایک اُلجھی ہوئی داستان ہے جو مورخوں کے منصفانہ فیصلے کی منتظر ہے۔

میں نے ایران کی سیاحت کی اور خصوصیت کے ساتھ آذربیجان کی بغاوت کے متعلق ہر قسم کے لوگوں سے تبادلہ خیال کیا، میں نے سفارت خانوں کے ریکارڈ بھی دیکھے اور غیر ملکی عینی شاہدوں کے بیان اور فیصلے بھی سنے، اور شہادت کے اس بڑے انبار میں سے ایک ہی بات چن سکا، وہ یہ کہ آذربیجان کی بغاوت و خود مختار حکومت کا قیام ایک زبردست اور حقیقی انقلاب کی "ڈریس ریہرسل" تھی۔ تودہ تحریک ختم کر دی گئی ہے مگر اس کی مختصر تاریخ کے نمایاں واقعات ایرانی حکومت، روس، برطانیہ اور امریکہ کے مدبروں کے دماغوں پر بھوت کی طرح چڑھے رہیں گے!۔

جعفر پشواری اور اس کے ساتھیوں نے تبریز کی خود مختار حکومت کی طرف سے اعلان کیا تھا کہ آذربیجان ایران سے الگ نہیں بلکہ ایک جمہوری نظام میں، داخلی اختیار کے ساتھ ایران ہی کا جزو رہنا چاہتا ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۵ء میں وہاں الیکشن ہوا، پارلیمنٹ چنی گئی۔ کیبنٹ بنی، پولس کا نظام قایم ہوا۔ قانون پاس ہوئے اور ٹیکسوں کی وصولی ہوئی۔ ایران سے تعلق ضرور رہا مگر برائے نام۔

اس خود مختار جمہوریت سے روس نے تعاون کیا اور امریکہ و برطانیہ نے اسے روسی حکمت عملی کہہ کر کوئی واسطہ نہ رکھا۔ طہرانی حکومت نے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور وزیر اعظم غوام اور پشواری کے درمیان طہران میں جو گفتگوئیں ہوئیں ان کی تفصیل تو کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ مصالحت کی یہ کوشش ناکام رہی۔ خیال یہ ہے کہ گفتگو ناکام رہنے کی اصل وجہ یہ تھی کہ پشواری کو اصرار تھا کہ آذربیجان میں باغی فوج کے افسروں کو جو ترقیاں ملی ہیں وہ تسلیم کی جائیں مگر طہرانی حکومت اس بات کو باقی ایرانی فوج کے افسروں میں بے چینی پیدا ہو جانے کے خیال سے مان نہیں سکتی تھی۔ بالآخر ایک سال کی طیاری کے بعد طہران نے فوج کشی کر دی۔ مگر اس فوج کے پہونچنے سے تین دن پہلے تبریزی حکومت کا شیرازہ بکھر گیا۔ ایران کے لوگوں کا خیال ہے کہ پشواری بہت سا روپیہ اور سامان لیکر روس چلا گیا ہے جو صرف اسّی میل پرے ہے، لیکن پشواری

کے دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ آذربیجان ہی میں ہے۔

میں نے اپنی سیاحت کے دوران میں اندازہ کیا کہ تبریز میں بے چینی سطح پر بالکل نہیں ہے۔ کیونکہ فوجی پہرہ بھی معمولی سا ہی رہتا ہے، لیکن میں اس خیال کو دماغ سے دور نہیں کر سکا کہ انقلاب کے مخالفوں کے باوجود، جمہوری حکومت نے ایک سال کی قلیل مدت میں جس قدر اصلاحات جاری کر دیں، اس شہر کے لوگوں نے ان باتوں کو شاید کبھی جانا بھی نہ تھا۔ ان تمام خرابیوں کے ہوتے ہوئے جو اس کم عمر جمہوری حکومت سے منسوب کی جاتی ہیں، اس نے شہر میں چار میل سڑک کو لتار سے بنوائی، گداگر اور پیشہ ور عورتیں شہر سے غائب ہو گئیں، ایک زچاؤں کا اسپتال قایم کیا، ایک یونیورسٹی قایم کی جس میں دوسرے شعبوں کے علاوہ میڈیسن، زراعت کے شعبے بھی ہیں۔ ریڈیو اسٹیشن بنایا، پولس کا انتظام ایسا تھا کہ عورتیں اندھیرے میں بھی بلا خوف آجا سکتی تھیں، قانون آراضی میں بھی اصلاح شروع کر دی تھی، طہران کا "لیبرلا" معطل پڑا تھا اسے پوری طرح نافذ کیا، افیون کی تجارت یکقلم ختم کر دی۔ حکومت کے دفتروں میں فالتو اور نکمے اسٹاف کی تخفیف کر کے کام اور قانون کا اجراء آسان کر دیا۔

ایسے کارناموں کے بعد بھی یہ نظام منتشر ہو گیا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس حکومت نے اپنی فوجی طاقت نہیں بنائی جو طہرانی فوج سے مقابلہ کر سکتی۔ حالانکہ طہرانی فوج اپنی شاندار وردی کے علاوہ کسی امتیاز کی مالک نہیں ہے۔ پھر آذربیجانی اسی نسل سے ہیں جس سے کاشغئی ہیں۔ اس جمہوری نظام کو عوام کی پوری ہمدردی حاصل نہیں ہوئی اور اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس خود مختار حکومت نے جب کسان سے زمینداری لگان وصول کیا تو وہ سمجھا کہ یہ حکومت پرانے زمیندار ہی کی قایم مقام ہے۔ اس نے زمیندار کے کارندے اور حکومت کے تحصیلدار میں فرق نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے وعدہ تو تھا کہ زمین اس کی ہو جائے گی۔ دوسری وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ نظام نے اپنے اوپر سے اس الزام کو ہٹانے کی کوشش مطلق نہیں کی۔ زار کے زمانہ ہی سے ایرانیوں کو روس کے نام سے بیزاری ہے، اور طہرانی حکومت کے خفیہ ایجنٹوں نے عوام میں روس کو زیادہ غیر مقبول بنا دیا تھا، جمہوری حکومت نے یہ کوشش ضرور کی کہ آذربیجانی عوام میں قوم پرستی کا جذبہ شدید ہو جائے۔ اور اگر یہ کوشش کامیاب ہو جاتی تو یقیناً طہرانی حکومت کا پروپگنڈا ناکام رہتا مگر قوم پرستی کا جذبہ ابھارنے کو زیادہ وقت زیادہ کوشش درکار تھی۔

میری سیاحت کے دنوں میں تبریز خاموش تھا، زندہ دلی کے آثار مفقود تھے۔ اقتصادی بدحالی شدید تھی۔ دن بھر کی مزدوری چھ تومان تھی، حالانکہ گدھے کا کرایہ دن بھر کے لئے سات تومان ہوتا ہے

کاروبار سرد تھا کیونکہ سرمایہ دار کو ڈر تھا کہ روس صرف اسّی میل پرے ہے۔

میری سیاحت کے دنوں میں آذربیجان کا ایرانی گورنر جنرل علی منصور تھا جو ایک وقت ایران کا وزیر اعظم بھی رہ چکا تھا اور مانا ہوا مدبر سلطنت تھا۔ علی منصور کو پوری امید تھی کہ امریکہ نے روپیہ کی مدد دی تو حکومت کا ہفت سالہ پلان کامیاب ہوکر حالات کو بدل دے گا۔

تبریز کی خود مختار حکومت کے ختم ہوجانے سے ایرانیوں میں قومی جذبہ اُبھر آیا تھا۔ شاہ نے آذربیجان کا سفر کیا اور نہایت پرجوش خیر مقدم ہوا۔ طہران کے غیر ملکی سفارت خانوں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ گویا مغربی طاقتوں نے روس پر فتح حاصل کی تھی!

میں سمجھتا ہوں کہ یہ اطمینان عارضی ہے، سوویٹ کے خیالات پھیل رہے ہیں۔ جن اسباب نے پہلا انقلاب کرایا ان کی جڑ زمین کے اندر ہے اور وہ اب بھی جیسے کے تیسے موجود ہیں۔ باغی جماعت متحرک ہے پہاڑوں میں ان کے تین ریڈیو اسٹیشن روزانہ پروپگنڈا کر رہے ہیں۔ اور حکومت تہران صرف امریکہ کا آسرا تک رہی ہے۔ لیکن امریکہ کی امداد گولے برسا کر آبادیاں تو تباہ و مسمار کر سکتی ہے، بھوکوں کا پیٹ نہیں بھر سکتی۔ ایرانی عوام کے لئے روٹی مہیا کرنا تو تہرانی حکومت ہی کا کام ہو اور وہی کر بھی سکتی ہے۔


## حُسن کی عیّاریاں
اور
## دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنادیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

## ترغیباتِ جنسی
اور
## شہوانیات مجلد

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری اور غیر فطری قسموں کے حالات کی تاریخی و نفسیاتی اہمیت پر نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز واقعات نظر آئینگے

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

# ساتواں باب

## (تشنۂ جواب)

شمالی صوبہ ماژندراں کے شہر رمسار میں پہونچ کر ایسا معلوم ہوا کہ گویا میں ایران میں نہیں ہوں۔ یہاں ایرانی تہذیب و تمدن جسے میں اپنی سیاحت کے دوران میں ہر لحظہ دیکھتا رہا ہوں۔ مفقود تھا، نہ وہ مشرقی مناظر تھے اور نہ اس کی صدائیں۔

ایرانی دوستوں نے اس علاقے کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ مگر جب میں رمسار پہونچا تو ایسا معلوم ہوا کہ ایران کے کسی شہر میں نہیں بلکہ قبل از جنگ کے کسی مغربی شہر میں پہونچ گیا ہوں یا امریکہ کا کوئی شہر اٹھا کر یہاں بسا دیا گیا ہے۔

بلندی پر ایک ہوٹل کی شاندار سفید عمارت کے دروازوں کے چمکتے ہوئے شیشے، وسیع اور ہوادار برآمدہ، کشادہ چکردار زینہ، لمبے چوڑے صحن میں خوش قطع چمن زار کی نیرنگی، نسترن و نسرین کے نظر فریب تختے، قسم قسم کے بلند درخت، الغرض ہر ہر چیز ستھرے پن کی زندہ شہادت تھی۔ بیرونی شان اور دلکشی سے زیادہ آرایش ہوٹل کے اندر تھی۔ ایران بھر میں صرف یہیں پانی کی بہم رسانی کا انتظام تھا جو صاف شفاف پہاڑی چشموں سے نلوں کے ذریعہ پہونچتا تھا۔ پورے ہوٹل میں کرمان و کاشان کے قیمتی قالینوں کا فرش تھا۔ اس سے بہتر ہوٹل تصور میں نہیں آسکتا۔

یہ ہوٹل سرسبز و شاداب پہاڑیوں کے بالکل دامن میں بنا ہے۔ ان پہاڑیوں پر گھنا جنگل ہے جہاں ہمہ قسم کے جانور اور پرند ملتے ہیں۔ دوسری طرف سمندر کی ساکن سطح کو سورج کی روشنی نے آئینہ بنا رکھا تھا پہاڑی سلسلے کی چوٹیوں پر بادلوں کا گھرا رہنا ایک پُرلطف منظر پیش کرتا تھا۔ غرض ہوٹل کے تمام جدید ترین سامان عشرت کے ساتھ سامنے قدیم زمانہ کا یہ جنگل ایسا نظارہ تھا کہ ایران تو کیا غالباً سارے ایشیا میں میسر نہ ہوگا۔

صرف سترہ سال پہلے رمسار کچے مکانوں کا ایک گاؤں تھا۔ رضا شاہ نے اس گاؤں کو دلکش تفریح گاہ بنا کر شہر آباد کر دیا۔ اس شہر کی تعمیر پر کتنی دولت خرچ ہوئی کوئی نہیں جان سکتا کیونکہ یہ رضا شاہ کی جیب خاص سے تعلق رکھتی تھی۔ اسی طرح یہ بھی پتہ نہیں لگ سکتا کہ اس کی تعمیر کے زمانہ میں مزدوروں کی کتنی تعداد ملیریا اور دوسری دباؤں کا شکار ہوئی۔

لیکن وہ لوگ بھی جو رضا شاہ سے کسی نہ کسی بنا پر خفا ہیں، اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ رمسار سا حسین شہر محض رضا شاہ کی کوشش کا نتیجہ ہو سکتا تھا کسی دوسرے کی بس کی بات نہ تھی۔

رمسار میں میری ملاقات ایک ایرانی سائنسداں سے ہوئی جو فرانس کا تعلیم یافتہ تھا، کہنے لگا:-

"ہمارے ملک میں دولت کی کمی نہیں، ہم فرانس سے زیادہ متمول ہیں، ہمارے زرعی وسیلے جرمنی سے زیادہ ہیں، لیکن رضا شاہ کی معزولی کے وقت سے ہم بے حس و حرکت کھڑے ہیں، کچھ کر نہیں رہے!"

یہ شکایت بجا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ ایرانی سرمایہ دار اپنی دولت کو دبائے بیٹھے ہیں۔ میرے خیال میں ایرانی سرمایہ دار دنیا بھر میں سب سے زیادہ خسیس اور بہت زیادہ زیرک ہے۔ اس کا ثبوت اصفہان میں کپڑے کی کامیاب صنعت سے ملجاتا ہے۔

رضا شاہ نے خود اصفہان آکر وہاں کے دولتمندوں کو بلایا اور ایک تقریر میں بتایا کہ اس زمانے میں مشین سے کام نہ لیکر ہاتھوں ہی سے کام لینا حماقت ہے۔ تم لوگوں کو اصفہان میں کپڑے کی ملیں قائم کرنا چاہئے۔ لوگ چپ رہے۔ وہ سمجھ نہ سکے کہ شاہ انھیں مشورہ دے رہا ہے یا یہ فرمان شاہی ہے۔ مشورہ کو تو ٹالا جا سکتا تھا مگر فرمان کی تعمیل لازمی تھی! دوسرے دن گورنر نے ان لوگوں کو پھر بلا کر شاہ کی مرضی بتائی۔ تب وہ لوگ مجبور ہو گئے اور ملیں قائم ہو گئیں جن سے بہت نفع ہو رہا ہے اور اصفہان، ایران کا مانچسٹر بن گیا ہے۔ لیکن باوجود اس کے کہ مالک بے حد منافع اٹھا رہے ہیں۔ ان کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ قلیل رقم کے صرف سے ایک ماہر انجینیر یورپ سے بلا کر رکھیں تاکہ وہ ان کی مشینوں کو بہترین حالت میں رکھ سکے اور یہ لوگ برٹش اور اٹلی کے کپڑے کی قیمتوں کا مقابلہ کر سکیں۔

۱۹۴۷ء کے موسم خزاں میں مجلس نے ایک سو دو ووٹ سے بمقابلہ دو ووٹ کے روس کے اس مطالبہ کو مسترد کر دیا کہ اسے شمالی ایران میں تیل نکالنے کے مراعات دئے جائیں۔ ایران میں تعلیم یافتہ طبقہ ہی پبلک اسپرٹ رکھتا ہے اور سیاسی معاملات کو دیکھتا سمجھتا ہے۔ ایران کی پبلک رائے کے معنی اسی طبقہ کی رائے ہے۔ اس طبقے میں جن لوگوں کے دلوں میں تودہ تحریک کی یاد باقی تھی اور اس تحریک کے ختم ہو جانے پر

جن کو ملال تھا، وہ لوگ اس فیصلے سے رنجیدہ ہوئے۔ لیکن دوسرے گروہ نے اسے ایک قومی فتحمندی سمجھا، انھیں یقین تھا کہ روس کے انکار کر دینے کے بعد ایرانی سرمایہ دار تیل کی صنعت میں فراخدلی سے سرمایہ لگائیں گے جو نفع بخش ہونے کے علاوہ سلافی ہمسایہ کے ساتھ وجہ مخاصمت کو بھی دور کر دیگا۔

لیکن ایرآن کا سرمایہ دار آج تک خواب گراں میں محو ہے، اور ایرانی تعلیم یافتہ طبقے کے دونوں گروہ لیفٹ اور رائٹ بازو والے، حیران ہیں کہ قوم و ملک کا حشر کیا ہونا ہے! کیونکہ وہ خوب واقف ہیں کہ روسی سرحد پر امریکن سرمایہ دار ایک ڈالر لگانے کو طیار نہ ہوگا اور نہ دوسرا کوئی ملک اس مخدوش کام میں ہاتھ ڈالے گا۔ جو قوم شمالی ایرآن میں نکالنے آئے گی، روس سمجھے گا کہ اس کے علاقۂ سرکیشیا کے تیل کو ہتیانے کی سازش ہے۔ اس لئے خواہ مخواہ روس سے جھگڑا کون مول لے؟

ایرآن کا تعلیم یافتہ طبقہ یہ بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ اس مشینی زمانے میں، جبکہ نہ صرف صنعت بلکہ زراعت اور فوجی ساز و سامان کے لئے بھی پٹرول کی ضرورت ہے، ایرانی تیل زمین کے اندر دبا پڑا نہیں رہنا چاہیے۔ ایک اعلان ہوا تھا کہ شمالی ایرآن کا تیل خود ایرآن نکالے گا۔ مگر سیاسی تذبذب کی صورت میں جو اسوقت ایرآن پر چھایا ہوا ہے، لوگوں کو بھروسا نہیں کہ ایرآن ایسا کر سکے گا۔

ایرانی تاجر اس میں شک نہیں کہ زیرکی و دانائی میں تمام دنیا کے تاجروں سے ہمسری کا دعوی کر سکتا ہے لیکن وہ معمار نہیں ہے، اس کا صنعتی مزاج نہیں ہے، اس لئے جس بات کا نتیجہ بہت عرصے بعد نکلے اس میں اسے دلکشی نظر نہیں آتی۔ ایرانی یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے خوب کہا کہ "ایرانی تاجر محض صراف ہے، وہ خرید و فروخت کر کے فوری نفع حاصل کرنا جانتا ہے، اس لئے اس کے اندر یورپ کے تاجروں کی سی وہ اسپرٹ نہیں ہے جو انھیں خطرہ کا مقابلہ کرنے پر طیار کر دیتی ہے۔"

ایرانی تاجر کی یہ فطرت حکومت ایرآن کو اس طرف لئے جا رہی ہے کہ خود حکومت تمام تجارت کی اجارہ دار بن جائے۔ حالانکہ امریکہ کا تاجر حکومت کے ایسے اقدام کو کبھی گوارا نہ کرے گا۔

ایرانیوں کے اس مخصوص کردار کا ایک خاص سبب ہے، غیر ملکیوں کے حملے، مسلسل سازشیں، ہر وقت کی دھمکیاں اور لوٹ کھسوٹ، اسی کے ساتھ ملکی حکمرانوں کا جبر و استبداد، یہ تمام باتیں ہیں جن کی وجہ سے ایک ایرانی کو اپنے ملک و قوم پر بھروسا نہیں رہا۔ کم از کم ایرانی تاجر تو ان دلیلوں سے اپنی معذوری ثابت کر دیتا ہے۔ لیکن یوروپین یا امریکن کی نظر میں اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اہلِ مشرق صبر و قناعت کے عادی ہیں اور راحت و سکون کی تلاش ان کی فطرت ہے اور ایسی کوئی صورت پیدا نہیں ہوئی جو ان روایات پر ایک کاری ضرب لگاتی، ایرآن میں نہ کوئی سماجی انقلاب ہوا نہ ذہنی! البتہ رضا شاہ نے ایرانی تاریخ کو

ایک دھکا دیا تھا، لیکن اس کا کام کرنے کا ڈھنگ ایسا نہیں تھا جو ایرانی تاجر کو تعمیری کاموں کے لئے اُبھار سکتا بلکہ وہ بھوچک اور مایوس زیادہ ہوگیا۔

ایران، غیر ملکوں خاص کر امریکہ سے قرضہ ملنے کی آس لگائے بیٹھا ہے۔ اور بلاشبہ ایسا قرضہ مل جانے سے ایران ترقی کر بھی سکتا ہے۔ لیکن اگر ایرانی زمیندار عقل سے کام لیتا اور مستعدی دکھاتا تو یقیناً ایرانی کاشتکار کا مقدر اس قرضے کے بغیر بھی بدلا جا سکتا تھا۔

ایران کی وزارت زراعت نے امریکن ماہر ڈاکٹر لایل ہیڈن کو بلا کر ایک زرخیز علاقے میں پانچ گاؤں پر تجربہ کرنے کے لئے مقرر کیا۔ اس ماہر نے بغیر کسی زرعی اصلاح کا قانون جاری کرائے نہایت قلیل صرف پر بہت زیادہ کامیابی حاصل کر کے دکھا دی۔ میں نے مزان کے گاؤں کو خود جا کر دیکھا، جہاں ڈاکٹر لایل نے تجربہ کیا تھا۔ ایرانی دہقان نے مکھی، مکڑی، جوں، بچھو اور دوسرے حشرات الارض کو ایک اٹل تقدیر کی طرح مان لیا تھا، لیکن ان پانچوں گاؤں میں آج کسی قسم کا کیڑا مکوڑا نہیں ہے۔ پورے ایران میں یہی ایک گاؤں میں نے ایسا دیکھا جہاں کے آدمی بدن نہیں کھجاتے تھے۔ کوئی خارشتی کتا بھی نظر نہیں آیا۔ اس کامیابی کے لئے ڈاکٹر ہیڈن نے فی گھر پونے دو ڈالر خرچ کئے، جس میں ایک تہائی سرکاری خزانے میں کسٹم ڈیوٹی کی صورت میں پہونچ گیا۔ ڈاکٹر ہیڈن نے حکومت ایران کو بتا دیا کہ اگر تین سال تک پانچ ڈالر فی کنبہ کے حساب سے خرچ کیا جائے تو پورا ایران جملہ وباؤں سے محفوظ ہو سکتا ہے۔ اس اسکیم پر باتیں بہت کی گئیں مگر ہنوز روز اول ہے۔ اس کا سبب متعین کرنے کے سلسلہ میں ایک یونیورسٹی کے پروفیسر نے بہت معقول بات کہی کہ:-

"ہماری ملک میں لوگ صرف زمینداری اور تجارت ہی سے روپیہ نہیں کماتے، بلکہ سیاست کو بھی نفع بخش بنا لیتے ہیں"۔

ایک ممتاز وکیل نے اعتراف کیا کہ لوگ دو دو کھاتے رکھ کر انکم ٹیکس کی چوری کرتے ہیں۔ ایران میں امریکہ کا فوجی مشن فوجی حالت سدھارنے کا کام کر رہا ہے۔ اس مشن نے چھ جرنیلوں کی برطرفی تجویز کی کیونکہ وہ رشوت کے خوگر بن گئے تھے۔ ایران کے فوجی افسر بالعموم غریبی یا معمولی حالت میں داخل ہوتے ہیں اور امیر بن کر سبکدوش ہوتے ہیں۔ بے اعتباری کی حد یہ ہے کہ ایرانی تاجر فوج کی سپلائی، ماہوار بل کے اصول پر نہیں کرتے بلکہ بازاروں کی طرح اسی وقت قیمت وصول کر لیتے ہیں۔ دُنیا کے ملکوں میں ایران ہی ایسا ملک ہے جس نے اندرون ملک کوئی قرضہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت پر ایرانی پبلک اور خاصکر دولتمند طبقہ کو بھروسا نہیں ہے۔

ایرانی تاجر کی زیرکی و ہوشمندی کا سب سے بڑا ثبوت ایران کے نیشنل بنک کے ریکارڈ سے ملتا ہے، جسے بریگیڈیر جرنیل امیر خسروی نے قایم کیا تھا۔ یہ رضا شاہ کا مقرب خاص تھا۔ اس بنک کی بنا رکھتے وقت یہ بات بنیادی طور پر مان لی گئی تھی کہ ایرانی بالطبع بددیانت نہیں ہے چنانچہ ملازموں کو اتنی کافی تنخواہیں دی جاتی ہیں کہ انھیں چوری یا رشوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ امیر خسروی کا یہ اصول بہت کامیاب رہا۔ اس وقت اس بنک کا گورنر ابوالحسن ابتہاج ہے اور اس کی قابلیت مسلمہ ہے۔ اس کے دشمنوں نے متعدد سیاسی اُلجھنوں میں پھنسا کر اسے ذلیل و رسوا کرنا چاہا مگر اس کی ساکھ کو صدمہ نہ پہونچا سکے۔

یہ بنک اپنے چار ہزار ملازموں کو معقول تنخواہوں کے علاوہ اور بھی خاص رعایتیں دیتا ہے۔ مثلاً انھیں خاص چھٹیاں بھی لینے کا حق دیا گیا ہے، ان کی صحت کا بیمہ کرتا ہے، ملازموں کی لڑکیوں کی شادی پر بنک کی طرف سے جہیز کے لئے ایک رقم دی جاتی ہے، ان کو سامان غذا سستی قیمت پر اور کم تنخواہ والوں کو بازار سے نصف قیمت پر دیا جاتا ہے، ملازموں کی بیویاں حاملہ ہوں تو زچگی کا خرچ دیا جاتا ہے غرض ابتہاج نے اپنے ادارے کو بددیانتی سے پاک رکھنے کے لئے بہت کچھ کیا ہے اور وہ اس میں کامیاب ہے۔ ایک ملاقات میں ابتہاج نے مجھ سے کہا کہ:۔

"اگر اسٹیٹ بنک کے چار ہزار ملازم کامل دیانت اور وفاداری کے ساتھ کام کر سکتے ہیں تو چار لاکھ کو بھی ایسا بنایا جا سکتا ہے، بشرطیکہ انھیں خدمت کا معاوضہ اتنا دیا جائے کہ وہ لالچ کا شکار نہ بن سکیں۔"

میں نے اکثر لوگوں سے یہ بات سنی کہ: "ایران میں سو ابتہاج ہوتے تو ایران کی سرزمین جنت کو شرما دیتی"۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ ایک انجینرنگ فرم کے دو انجینروں نے ایران کے اقتصاد پر آٹھ سو صفحے کی رپورٹ طیار کر کے اپنے فرم کو بھیجی تھی (تاکہ امریکن حکومت کو اعلیٰ عمال کے صحیح اعداد و شمار اور اصل واقعات و صورت حال کی پوری اطلاع پہونچ جائے) اس رپورٹ کی بنا یہ تھی کہ ایران کو قرضہ دیا جائے اور وہ قرضہ خود بخود ادا ہو جائے۔ اس کتاب میں اس رپورٹ پر تبصرہ تو کیا نہیں جا سکتا لیکن مجھ جیسے ناواقف کار آدمی کی نظر میں اس رپورٹ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایرانی زراعت کو درختوں کی بیماریوں سے جو زبردست نقصان ہوتا ہے، اس کے دفع کرنے کی بڑی موثر تدبیر بتائی ہے، کیڑے مکوڑوں کی بدولت اناج کی پیداوار میں ایران کو تین کروڑ ڈالر کا سالانہ نقصان ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر رپورٹ کی ہدایات پر عمل کیا جائے تو ایران کو ڈھائی کروڑ سالانہ کی بچت ہو سکتی ہے۔

ایران، دُنیا میں سب سے زیادہ چائے پینے والا ملک ہے، لیکن سماوار، چائے اور استکان

(کانچ کا چھوٹا گلاس) یہ تینوں لفظ روسی ہیں۔ ایران، خود بھی چار ہزار ٹن چائے پیدا کرتا ہے؟ لیکن ایک کمزور ڈالر کی چائے باہر سے آتی ہے۔ حالانکہ بحر قزوین کے علاقے میں بیس ہزار ایکڑ زمین ایسی پڑی ہے جہاں چائے کی کاشت بڑھا کر ایران غیر ملکی چائے سے بے نیاز ہو سکتا ہے لاکھوں ڈالر بچا سکتا ہے۔ اسی طرح وہاں زمین کی پیداواری طاقت کو بھی دوگنا کیا جا سکتا ہے۔

وزیر اعظم غفام نے ایک ملاقات میں مجھے بتایا کہ بہت بڑے علاقے کو قابل کاشت بنا کر زمین کسانوں کو مفت دیجا سکتی ہے۔ دس پندرہ سال ان سے کوئی ٹیکس وصول نہیں کیا جائے گا، مگر اس کے لئے بیرونی قرضے کی ضرورت ہے۔ یہ ایرانی حکومت کا طریق کار ہے، ورنہ بہت سا کام بغیر بیرونی قرضے کے بھی انجام پا سکتا ہے۔

سرزمین ایران غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے اور زرخیز بھی، لیکن ایسا ملک اور یہ قوم، دیکھئے تو سر سے لیکر پاؤں تک، زخم ہی زخم ہے!

تاریخ کے ایک دور میں ایران دنیا کی زبردست طاقت رہ چکا ہے۔ میں نے ایک ایرانی میوزیم میں ڈھائی ہزار سال پرانا فولادی ہل دیکھا۔ یہ ہل ان تمام ہلوں سے بہت زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے جو اسوقت ایرانی کاشتکار استعمال کرتے ہیں، مگر کسی کو توجہ نہیں۔ اس لئے آخر میں یہ سوال سامنے آجاتا ہے کہ نجات کی صورت کون سی ہے؟ میرے خیال میں ایران کو ایک مضبوط ہاتھ کی ضرورت ہے! پھر یہ سوال ہوتا ہے کہ وہ رضا شاہ ایسے آدمی کا ہاتھ ہو، یا دارا اور شاہ عباس جیسے مصلحوں کا؟ آیا وہ ہاتھ ایرانی سرزمین سے اُٹھنے والے انقلاب میں ملے گا یا روس کی ڈکٹیٹری کی صورت میں نمودار ہوگا؟ یا پھر واشنگٹن و لندن کی مالی امداد ہی نجات کی صورت پیدا کرے گی؟

ایک غیر ملکی مقیم ایران نے مجھ سے کہا کہ:-

"ایک بلین (سوملین) ڈالر کا قرضہ اور ایک سو یوروپین یا امریکن ماہر و انجینئر دس سال میں ایران کی صورت بدل دے سکتے ہیں!"

بہرحال دو باتیں اٹل ہیں: اس مشینی عہد کی ترقیوں کے زمانہ میں ایران کا جمود عرصہ تک قایم نہیں رہ سکتا، اور ترقی و خوشحالی کے لئے جو پروگرام بھی بنایا جائے گا اس کی ابتدا زمین اور کاشت کی اصلاح ہی سے ہوگی۔

---

# آٹھواں باب

## (قاہرہ)

جنگ کے زمانہ کا قاہرہ کچھ اور تھا، اور ۴۸ء کا کچھ اور اب وہ بالکل پہلے کا سا قاہرہ ہو گیا تھا وہی کاہلی، وہی چیخ کر بات کرنا وہی عمامہ پوش Dragoman وہی گداگروں کی کثرت اور وہی خوانچہ فروشوں کی بھرمار۔ ایام جنگ کی خوشحالی مفقود تھی۔

بڑے بڑے ہوٹل آدھے خالی پڑے تھے، اور ان ہوٹلوں کے بار روم اسپتال کی طرح خاموش تھے۔ بڑے بڑے بازاروں کے دوکاندار گاہکوں کی کثرت سے بوکھلائے ہوئے نہ تھے بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ سونا بٹورنے کا زمانہ ہوا ہو چکا تھا۔

بایں ہمہ، یورپ سے اڑ کر قاہرہ پہونچ جانا ایک عجیب اور حرکت میں لے آنے والا تجربہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ آسمان کی بلندی سے کسی نئے براعظم پر نہیں بلکہ کسی نئے کرے پر ٹپکا دئے گئے ہیں۔ جہاں کی آب و ہوا نئی، تہذیب نئی اور لوگ مختلف ہیں۔ بازاروں میں مال و اسباب کی کثرت حیران کر دینے والی تھی۔ یورپ کو چھوڑئے، سوئٹزرلینڈ میں نہ تو ڈالر کی حکمرانی تھی اور نہ ڈالر وہاں ہیرو کا درجہ رکھتا تھا اسلئے سوئٹزرلینڈ کی ٹرین "ڈی لکس" کے مسافروں کو بھی قہوہ میں سیکرین ملتی تھی۔ لیکن قاہرہ میں ڈالر کا قحط ہونے کے باوجود شکر کیا معنی کسی چیز کی کمی تھی ہی نہیں، وہاں نہ کسی چیز کا راشن تھا اور نہ کوئی شے ایسی کہ قابل حصول نہ ہو۔ قاہرہ میں لوگ چیزیں ڈھونڈھتے نہیں پھرتے تھے بلکہ خود سامان خریداروں کا منتظر رہتا تھا۔ یورپ کی فاقہ کشی کے بعد قاہرہ میں کھجور اور انجیروں کے انبار، کیلے امرود کے ڈھیر، آموں کی افراط دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

مصر میں جنگ نے کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹایا نہ تھا۔ عیش و آرام کے اسباب مغربی ملکوں میں ناپید ہو گئے تھے مگر مصر میں کثرت سے ملتے تھے۔ مصر کی راجدھانی ایک ایسا شہر تھا جہاں کسی کو قیام گاہ کی

جستجو میں سرگراں نہیں ہونا پڑتا تھا - زیورچ اور جنیوا میں ڈالر کی بڑی ارزانی تھی مگر وہاں سیاحوں کو قیام و طعام اور نغمہ و شراب اس آسانی سے میسر نہیں ہو سکتے تھے جس طرح قاہرہ میں، شبینہ کلب، رقص گاہیں، نے خانے اور سینما، نہایت خندہ پیشانی سے سیاحوں کا خیر مقدم کرنے کو ہمہ وقت طیار تھے۔ ہر قسم کی عیاشی دسترس کے اندر تھی اور اس کے مہیا کرنے والے موٹر پر سیاحوں کا پیچھا کرنے کو موجود تھے۔

بیروزگاری شدید ہونے کے باوجود قاہرہ کے بازاروں میں ہر قسم کے سامان کی کثرت دیکھ کر یورپ سے آنے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اور سب سے زیادہ متعجب کرنے والی چیز یہاں کا تضاد ہے۔ ایک طرف قدیم اہرام اور عالیشان مسجدوں کے پرانے گنبد و مینار اور دوسری طرف جدید وضع کی شاندار و دلکش عمارتیں اور پھر اسی کے ساتھ کچی جھونپڑیاں بھی لق و دق صحرا کے بالکل کنارے ایسے باغ نظر آتے ہیں جو دنیا کے کسی شہر میں نظر نہیں آ سکتے۔

بیش قیمت اور شاندار امریکن موٹریں دوڑتی پھر رہی ہیں اور اُسی کے ساتھ اونٹوں اور گدھوں کے قافلے بھی ہٹو بچو کہتے گزر رہے ہیں۔ مصری لوگ دنیا میں سب سے زیادہ خوش باش اور خرچیلے ہیں اور یورپ کا تازہ ترین فیشن قاہرہ کی سڑکوں پر عام طور پر ہر جگہ نظر آتا ہے۔ مصری قوم اتنی ہی خلیق و باتمیز ہے جتنی دُنیا کی کوئی قوم ہو سکتی ہے مگر افلاس اور غریبی بھی اس ملک میں انتہا کو پہونچی ہوئی ہے۔

ایران کی طرح قاہرہ میں بھی عورتیں نقاب پوش رہتی ہیں۔ لیکن وہ مصری لڑکیاں جو نقاب نہیں ڈالتیں اور سرخی و غازہ، پوڈر وغیرہ کمال صناعی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں، دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار ہو سکتی ہیں۔ قاہرہ میں مرد عورت بالعموم آدھی درجن زبانیں بلا تکلف بول سکتے ہیں۔ مگر دوسری طرف بے شمار مصری اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔ اس شہر میں نمائش بے حد اور سنجیدگی کم ہے۔ فوری طور پر وہاں بڑے سے بڑا واقعہ رونما ہو سکتا ہے مگر استحکام و استقلال کم باتوں میں ہوتا ہے۔ وہاں اگر سنجیدگی و ہم آہنگی دیکھی جا سکتی ہے تو اس کے ساتھ شور بھی ایسا ہے جو کانوں کے پردے پھاڑ دے، اگر وہاں کے مرد بالعموم بلند آواز سے باتیں کرنے کے عادی ہیں تو وہاں کی عورتیں نرم کلامی کی عادی ہیں، اگر وہاں خونچے والے بدتمیز و گستاخ ہیں تو اسی کے ساتھ بڑے دوکاندار صد درجہ مہذب و شائستہ ہیں۔

قاہرہ کی ٹیکسیاں یورپ کے اکثر شہروں کے مقابلہ میں زیادہ چمکیلی اور شاندار ہیں۔ امریکن بسیں جس کثرت سے قاہرہ میں چلتی ہیں زیورچ میں بھی نہیں دیکھی تھیں حالانکہ زیورچ ہی ایک ایسا شہر ہے

جہاں ڈالر بکثرت اور ارزاں ہے۔

اسکندریہ کے شیپرڈ ہوٹل سے پانچ منٹ چلئے تو آپ کو دنیا کی حقیر ترین بستیاں اور جھونپڑیاں دکھلائی پڑیں گی جہاں کی گندگی اور بو دماغ پریشان کردے گی، جہاں بچوں کی اکثریت آنکھوں کی بیماری میں مبتلا نظر آئے گی۔ گداگر فٹ پاتھ پر لاشوں کی طرح بے حس و حرکت پڑے نظر آئیں گے۔ مصر کی اوسط اموات ساری دُنیا سے زیادہ ہے۔ ایک سال کے ہر چار بچوں میں سے ایک مرجاتا ہے۔

الغرض قاہرہ، تضاد و تخالف کا مرکز ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی بنیاد ۵۲۵ قبل مسیح پڑی تھی۔ اس کی آبادی ۱۹۰۰ء میں ساڑھے چھ لاکھ سے کچھ ہی زیادہ تھی اور آج بیس لاکھ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔

غیر ملکی سیاح جب مصر کی راجدھانی میں پہونچتا ہے تو لبِ صحرا ایک عالیشان شہر بسا دینے والی قوت و ذہانت پر عش عش کرنے لگتا ہے۔ مشرق اگر اپنی خوبیوں اور خرابیوں کو انتہائی صورت میں کسی جگہ پیش کرسکتا ہے تو وہ جگہ قاہرہ ہے۔ افریقہ بھر میں سب سے بڑا اور ہنگامہ آفریں شہر ہونے کے ساتھ ہی قاہرہ ہزار مسجدوں والا شہر بھی کہلاتا ہے۔ یہاں ایک ہزار سال کی قدیم یونیورسٹی "ازہر" قایم ہے۔ اس جامعہ میں تیرہ ہزار لڑکے تعلیم پاتے ہیں، جن میں چھ ہزار دیگر ممالک کے ہیں۔ ایک مصری عالم کے لفظوں میں "قاہرہ اسلامی دُنیا کا دھڑکتا ہوا دل ہے"۔

قاہرہ میں ایک جماعت "اخوت اسلام" کے نام سے قایم ہے جو ہر جماعت اور نئی تحریک کی دشمن ہے۔ اگریکلچر کالج کے طلبہ و طالبات اور پروفیسروں نے ایک محفل رقص و سرود جمائی جس میں "ایوننگ ڈریس" ضروری تھا، اس محفل میں بادۂ ارغواں کے دور بے تکلف چلے۔ "اخوت" والوں نے اس کو نجس اور گندہ کا لقب دیا۔

میرے قیام قاہرہ کے دوران میں "اخوت" والوں نے ایک ادیب کی گرفتاری کا مطالبہ کیا کیونکہ اسنے اپنے کسی مضمون میں اس بات کا مذاق اُڑایا تھا کہ لڑکا اور لڑکی ایک دوسرے کو جانے پہچانے بغیر شوہر اور بیوی بن جاتے ہیں۔ "اخوت" کے ایک اخبار نے ان اخباروں کی اشاعت روک دینے کا بھی مطالبہ کیا جو لباس غسل میں لڑکے لڑکیوں کی تصویریں شایع کرتے ہیں۔

قاہرہ یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے مجھے ایک شام بدیعہ میں مدعو کیا۔ بدیعہ ایک نہایت فیشن ایبل اور مشہور ریسٹوران ہے جہاں الازہر اور اخوت کی طاقت و اثر کے باوجود نوجوان لڑکیاں ناچتی گاتی ہیں۔ اس مجلس میں شریک ہونے سے پہلے میں تصور میں نہ لاسکتا تھا کہ مسلم تماشائی ایسے منظر کو گوارا کرسکتے ہیں، خاص کر جس شہر میں جامعہ ازہر قایم ہو!

میں نے اپنے میزبان دوست سے سوال کیا کہ مسلمانوں کے اتنے بڑے مجمع میں اسلامی تعلیم کی یہ پامالی کیونکر ممکن ہے تو اس نے کہا کہ "یہ قاہرہ ہے!"

مصری پایہ تخت میں کسی مذہب کی تعلیم کا کوئی اثر نہیں ہے اور یہ بالکل سچ ہے کہ:-

"قاہرہ ساری دنیا کے شہروں میں سب سے زیادہ کھُل کھیلنے والا شہر ہے"۔

مصریوں کی متضاد طبیعت اس سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ایک طرف مصر جو ڈالر کا بھوکا ہے یہ بھی چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ غیر ملکی سیاح یہاں آئیں، - - - - - - - - - - - - - - - - - - - مگر دوسری طرف ان کی قوم پرستی کا اشتعال غیر ملکیوں کے خلاف متشدد مظاہرے بھی کراتا رہتا ہے۔

مصری حکومت چاہتی ہے کہ سیاح زیادہ سے زیادہ تعداد میں مصر آئیں مگر ساتھ ہی پاسپورٹ کے حاصل کرنے میں اتنی اُلجھنیں اور دقتیں پیدا کی جاتی ہیں کہ سیاح گھبرا جاتا ہے۔

مصری حکومت چاہتی ہے کہ غیر ملکی سرمایہ مصر میں لگے مگر اس کے لئے شرطیں ایسی رکھی جاتی ہیں کہ یہ کام مشکل ہو جاتا ہے۔ رشوت کا یہ عالم ہے کہ جو غیر ملکی، مصر میں کاروبار کر رہے ہیں وہ اپنا کام کسی دوسرے ملک میں منتقل کرنے کی فکر میں ہیں۔ مصر کی اقلیتیں انھیں وجوہ پر غیر مطمئن ہیں۔ یہودی حکومت اسرائیل کی طرف نظریں لگائے ہیں اور آرمینین، روس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ مصر کو اسرائیل سے نفرت اور روس کی طرف سے شبہ ہے۔

غرض مصر میں منفی و مُثبت طاقتیں متوازی کام کر رہی ہیں جیسے کسی چیز کے حرکت میں آنے سے اس کا سایہ بھی متحرک ہو جاتا ہے۔ قاہرہ کے تمدن کا تضاد انسان کو حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

لسانی اعتبار سے قاہرہ اصلاً عرب ہے لیکن کلچری پہلو سے وہ قدیم و جدید اثرات کا مجموعہ ہے قدیم و جدید آرزؤں کا معرکہ ہے! وہاں پرانے اور نئے خیالات کا مجادلہ جاری ہے! اور یہی وہ خصوصیت ہے جو قاہرہ کو ایک جیتا جاگتا ڈراما بنا دیتی ہے!

یہ سمجھنا غلط ہو گا کہ دوسرے ملکوں کی راجدھانیوں کی طرح قاہرہ بھی ایک کاسموپولیٹن (مخلوط النسل آبادی کا شہر) ہے۔ اس کے برخلاف قاہرہ جو کرتا ہے وہی پورا مصر، بلکہ عرب دنیا کا ایک بڑا حصہ کرنے لگتا ہے۔ قاہرہ کا جغرافیہ، تاریخ، دولت، ضخامت، کلچر، سماجی ہنگامہ خیزی اور ذہنی شورش ــــ روایتی اور جدید، دونوں قسم کی ــــ قاہرہ کی اس سائیکالوجی کا جواز ہیں۔ قاہرہ، اپنی پُرعظمت قدیمیت کے باوجود اپنی خامیوں اور گمراہیوں کو نوجوانی کے جوش میں قابلِ اعتناء

نہیں سمجھتا ہے - وہ اپنی نوحصول اہمیت و دولت پر اس قدر نازاں ہے کہ اس نے فلاحوں (کسانوں) کی حالت زار کو بھی نظر انداز کر دیا ہے - وہ اپنے وقار اور اپنے ارادے کو دنیا اور خاص کر عرب ملکوں کے سامنے اس طرح پیش کرنا چاہتا ہے جیسے کہ کوئی نوجوان لوگوں کے سامنے اپنی طاقت و جوانی کی نمائش کرے ۔ مصری حکومت کے سامنے اس وقت بہت سے بین الاقوامی مسئلے ہیں! ان میں اسرائیلی حکومت اور نہر سوئیز کے علاقے اور سوڈان کا انخلاء بہت اہم ہیں - ان مسئلوں نے مصر میں بخار کی سی حالت پیدا کر رکھی ہے - وزارت خارجہ کے دفتر سے مجھے بہت سا لٹریچر دیا گیا جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سوڈان پر قاہرہ کے جو حقوق ہیں ان سے انکار ممکن نہیں، ایک اقتباس یہ ہے :-

"بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ اقتصادی ترقی اور زراعت کو وسیع کرنے کے لئے مصر کا انحصار، سوڈان پر ہے، بنجر زمینوں کو صرف اسی صورت میں قابل زراعت بنایا جا سکتا ہے کہ آبپاشی کا انتظام ہو، اور یہ بات جب ہی میسر ہو سکتی ہے جب نیل کے پانی پر پورا کنٹرول ہونے کی اسکیم پر عمل در آمد ہو، اور طغیانیوں کے پانی کا ذخیرہ کیا جا سکے اور یہ حقیقت کہ مصر کی خوشحالی کا تمام تر انحصار بالائے نیل پر پورے کنٹرول اور اس پانی کے مناسب استعمال پر موقوف ہے، مصری مدبرین سلطنت کے دماغوں میں مرتسم ہو چکی ہے، جو گزشتہ سو سال سے برابر جڑ پکڑتی جا رہی ہے!"

ایک غیر ملکی حکومت اگر سوڈان کے نظم و نسق میں دخیل ہو تو بلا شبہ نیل کا پانی روک کر مصر کی خود مختاری کو بے معنی اور اس کے وجود کو خطرے میں ڈالا جا سکتا ہے - لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ سوڈانیوں کو اپنے مقصد کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا جائے تو مصری آتش بپا ہو جاتا ہے -

قاہرہ کے سوڈانی باشندوں نے اپنے لئے ایک مقام بنا لیا ہے - یہ لوگ بالعموم ادنے قسم کے روزگار کرتے ہیں مگر مصری اور اجنبی سب اس پر متفق ہیں کہ سوڈانی بالعموم قابل اعتماد ہوتا ہے - سوڈانی قاہرہ میں ہوٹلوں وغیرہ میں خدمتگاری یا دولتمند مصریوں اور غیر ملکیوں کی نجی ملازمتیں کرتے ہیں، کچھ ٹیکسی ڈرائیور بھی ہیں - یہ لوگ نہایت سنجیدہ و متین اور تمیز دار ہوتے ہیں - مصری جس قدر بسیار گو ہیں، سوڈانی اتنے ہی کم گو ہیں - سوڈانی بالعموم دراز قد، چوڑے چکلے، مضبوط و توانا ہوتے ہیں، جسمانی و اخلاقی دونوں اعتبار سے توانا! لیکن اس کے باوجود مصری وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر کے سامنے جب سوڈان کو عام رائے دہی کا حق دینے کی بات میرے منہ سے نکلی تو معلوم ہوا کہ میں نے اس افسر کی نہیں بلکہ پوری مصری قوم کی توہین کی ہے -

مشرق وسطیٰ کے تمام اسلامی ملکوں میں، تعلیم یافتہ عورت، خیال و عمل کے لحاظ سے اتنی ترقی یافتہ نہیں ہے جتنی مصری عورت ہے۔ اور اسی طرح مصر کی جاہل اور قدامت پرست عورت کی طرح کوئی نیک بھی نہیں ہے۔

مصر کی نئی روشنی والی نسل کی لڑکیوں کو اجنبی لوگ FLAPPER (یعنے ایسی لڑکی جو عام صحبتوں میں شریک ہوتی ہو) کہتے ہیں۔ ممکن ہے یہ غلط ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ مصری لڑکیاں قدیم اثر و رسوخ سے ہٹ کر آزاد زندگی گزارنے پر تل گئی ہیں، ایسی باغی لڑکیوں کی گنتی اگرچہ ابھی زیادہ نہیں لیکن ان کی خود رائی متحیر کر دینے والی ضرور ہے۔ انکا نعرہ "آزادی" اور عمل "خود نمائی" ہے۔ وہ جدید تمدن کی آرائش و زیبائش کے تمام طریقے استعمال کرتی ہیں اور اپنے جسم کے سڈول پن پر یورپ کی لڑکیوں کی طرح فخر کرتی ہیں۔ ساحل پر غسل کرنے کا چست لباس، جسے مصری بوڑھیاں "شیطان کی ایجاد" کہتی ہیں، لڑکیاں اسکے پہننے میں اپنی شان سمجھتی ہیں۔ مصری لڑکیاں سینما دیکھنے کی اتنی شوقین ہیں کہ ہفتے میں دو بار ضرور جاتی ہیں۔ گھر پر نوجوان دوستوں سے ملاقات کے امکان کم ہیں اس لئے سینما بہترین وعدہ گاہ ہے۔ وہ پارٹیوں اور رقص کی محفلوں میں شریک ہوتی ہیں اور کبھی کبھی سگریٹ بھی پی لیتی ہیں۔ احترام نسوانیت کے خیال سے سگریٹ نوشی عام اور شدید نہیں ہے۔ اسے ہالی ووڈ کے تمام فلم اسٹاروں کے نام یاد ہیں اور غیر ملکی ملاقاتیوں کے سامنے اسے یہ کہنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ کس فلم اسٹار کو دوست بنا سکتی ہے اور کس کو شوہر۔ ایک مسلم گھر پر ایک ٹی پارٹی میں ایک لڑکی کو میں نے خود یہ کہتے سنا کہ وہ کیری گرانٹ کو دوست بنا سکتی ہے، ہربرٹ مارشل کو شوہر اور کلارک گیبل کو یہ بھی اور وہ بھی! جب میں نے اسے ٹوکا کہ اس کے گھر والے اسے کیونکر پسند کریں گے تو بولی کہ "میرے باپ کا تو انتقال ہو چکا ہے۔ اور ماں سمجھتی ہے کہ میں پوری طرح گمراہ ہو چکی ہوں، دادی البتہ یہ عقیدہ باندھے بیٹھی ہے کہ ایک دن مجھے ہدایت ضرور ملے گی اور میں بے دینی کی راہ چھوڑ دوں گی۔ حالانکہ میں نے انسے کہہ دیا ہے کہ میں ان کی طرح کی نہیں بلکہ نئی قسم کی عورت بننا چاہتی ہوں! میں اپنی معاش کی خود کفیل ہوں اس لئے کوئی مزاحم نہیں ہو سکتا، آزاد ہونا بڑے لطف کی بات ہے!"

پرانی اور اسلامی روایات کی پامالی کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ بدتمیز ہو گئی ہیں، نفاست و شائستگی کا انھیں اتنا ہی شدید احساس ہے جس طرح جدید لباس اور بناؤ سنگھار کا! چنانچہ مصر کی جدید عورت اصل میں نتیجہ اور رمز و علامت ہے اس سماجی شورش کی جو دو عظیم جنگوں کے درمیانی وقفے میں مسلم ملکوں کے اندر ہوتی رہی ہے۔ اس شورش کو اعلیٰ اور درمیانی طبقے کی مسلم لڑکیوں کو

جدید تعلیم ملنے سے اور بھی تقویت پہونچی ہے۔

ہر چند مردوں کی طرف سے کافی مخالفت ہوئی مگر سنہ ۳۸ء سے مصری یونیورسٹی میں لڑکیوں کا داخلہ شروع ہوگیا تھا۔ آج مصر کے پانچ ہزار ڈاکٹروں میں ڈیڑھ سو عورتیں ہیں۔ ایسے ملک کے لئے جہاں یہ کہاوت ہو کہ عورت دو ہی بار گھر سے نکلتی ہے، ایک شادی کے بعد رخصت ہو کر دوسرے مر کر۔ وہاں بیس سال کی مدت میں ڈیڑھ سو عورتوں کا ڈاکٹر ہوجانا واقعی حیرت کی بات ہے۔

ایران کے روشن خیال علماء کی طرح مصر کی تعلیم یافتہ عورت بھی اس کو غلط کہتی ہے کہ اسلام عورت کو کمتر سمجھتا یا اس کی کمتری کا ذمہ دار ہے۔ مسلم عورت جس ادنے درجے میں پہونچا دی گئی ہے مصر کی تعلیم یافتہ عورت کا عقیدہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی تعلیم کے خلاف ہے۔

اسماء فہدی جو زنانہ کالج میں اسسٹنٹ ڈین ہے، لکھتی ہے کہ:-

"یورپ والوں کا یہ خیال غلطی پر مبنی ہے کہ اسلامی احکام مسلم عورتوں کو تعلیم دئے جانے کے خلاف ہیں۔ اس کے برخلاف اسلام عورتوں کی تعلیم پر نہایت زور دیتا ہے۔ پیغمبر اسلام کی بڑی خواہش تھی کہ ان کی بیویاں لکھنا پڑھنا سیکھ جائیں۔ رسول خدا کی حدیث ہے کہ علم کا حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت کا فریضہ ہے۔ اسلامی ادب میں ایسے حوالے ملتے ہیں، جن سے لڑکے لڑکیوں کا ایک ہی مکتب میں پڑھنا ثابت ہوتا ہے۔ مسلمانوں کی سوانحعمریوں میں بہت سے اذکار ملتے ہیں کہ عورتیں ادب اور مذہبیات کے مطالعہ میں ممتاز ہوسکتی اور مردوں کو لکچر دیا کرتی تھیں۔"

مصر کی یہ عالم خاتون مسلم عورت کے اس "ذہنی و روحانی زوال" کا ذمہ دار قدامت پرستی کو قرار دیتی ہے۔ یہ خاتون مسلمانوں کی اس جہالت و عصبیت کو اس عقیدے کا سبب قرار دیتی ہے کہ:-

"عورت کو جاہل رکھ کر چار دیواری میں بند رکھا جائے تو اس کی عصمت محفوظ ہے!"

اسماء فہدی کے اس مضمون نے "اخوت اسلامی" کے حلقوں میں ہلچل ڈالدی اس لئے یہ مضمون کتابی صورت میں شایع ہوا تو وہ کتاب شاہ فاروق سے معنون کی گئی۔

سنہ ۴۵ء میں ایگریکلچر کالج میں ۳۷ مصری عورتیں داخل ہوئیں اور تین لڑکیوں نے جرأت کی اور انجینرنگ کالج میں داخلہ کرالیا۔ جرنلزم کے اسکول میں مردوں سے زیادہ عورتیں ہیں۔ اسی اسکول کی تعلیم یافتہ متعدد خاتونیں آج متعدد اخبار رسالے ایڈٹ کر رہی ہیں۔

بایں ہمہ یہ کامیابیاں اور ترقیاں شہروں تک محدود ہیں۔ مصر کے دہقانی ہنوز فراعنہ کے عہد میں

جی رہے ہیں۔

مصر کی نئی نسل کی لڑکیوں کی یہ پیشقدمیاں اسی طرح سماجی اور ذہنی شورش و انتشار کی علامت ہے جس طرح طلبہ کے مظاہرے اور ہنگامہ خیزیاں۔ پورے مشرق وسطیٰ میں یونیورسٹی کے طلبہ اتنے پرجوش و عمل نہیں جتنے مصر کے ہیں۔ سنہ ۴۶ء میں میڈیکل طلبہ کے ایک مظاہرے کو پولس نے منتشر کر دیا تو انھیں اتنا غصہ آیا کہ تمام درسی کتابیں جلا دیں اور لیبوریٹری کا سامان توڑ پھوڑ ڈالا۔ ظاہر ہے کہ تقریباً ایک لاکھ ڈالر کا یہ نقصان پولیس کا نہیں بلکہ خود ان طلبہ کا نقصان تھا۔ یونیورسٹی کھلنے پر یہ نوٹس نکلا کہ تمام طلبہ کو پہچان کے کارڈ رکھنا لازمی ہے تاکہ آیندہ اگر وہ یونیورسٹی کا نقصان کریں تو ان سے یا اُن کے سرپرستوں سے وصول کیا جا سکے۔

مصر کے لوگوں میں باغیانہ اسپرٹ عام ہے، صرف نئی نسل کے لوگوں میں نہیں۔ جنگ کے بعد سے بے شمار مظاہرے اور بلوے ہو چکے اور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مظاہرے برٹش کے خلاف ہوتے ہیں کبھی تمام غیر ملکیوں کے خلاف۔ کبھی وہ اسرائیل کا مسئلہ ہوتا ہے اور کبھی سوڈان کا۔ اور اب تو خود مصری حکومت کے خلاف بھی مظاہرے ہونے لگے ہیں۔ غرض ہنگامہ آرائی کے لئے مصریوں کو حیلہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ قومی اور بین الاقوامی حیلہ ہر وقت طیار رہتا ہے۔ قاہرہ کے ایک ماہر تعلیم نے اس ہنگامہ آرائی کا سبب یہ بتایا کہ طلبہ کی تعداد قاہرہ میں بہت زیادہ ہے ایک دوسرے ماہر تعلیم نے اس طرح رائے زنی کی کہ:-

"ہمارا ملک غیر ترقی یافتہ ہے اور اپنے اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے تمام لوگوں کو کام نہیں دے سکتا!"

اور یہ سچ بھی ہے کہ حکومت نے اسی شورش کے دباؤ سے بہت سے محکمے بیکار یا ضرورت سے زاید کھول رکھے ہیں تاکہ کچھ لوگ کھپائے جا سکیں اور زیادہ آدمی کھپانے کی خاطر تنخواہیں کم کی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے رشوت کی گرم بازاری ہے، چنانچہ نوجوان طبقہ جب روزگار نہیں پاتا تو شورش پسند بنجاتا ہے مصر میں ابتدائی تعلیم عام ہے اور پڑھے لکھے بے روزگاروں کی کثرت اسی کا نتیجہ ہے۔ مگر مصر میں ابھی صرف چالیس فیصدی بچے ابتدائی درسگاہوں میں داخل ہو سکے ہیں۔ ابتدائی تعلیم پر جتنا روپیہ صرف ہوتا ہے اس کا دوگنا اعلیٰ تعلیم پر خرچ کیا جاتا ہے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ مصر کی روح اس کے جسم سے زیادہ قوی اور اس کی آرزوئیں ان کے پورا ہونے کے ساز و سامان سے بہت زیادہ ہیں۔ قومی انتشار کی حالت میں ایسے نوجوانوں کا ذاتی انتشار بہت زیادہ وزنی ہو جاتا ہے، جن کو غیر مذہبی قسم کی تعلیم ملی ہو۔ مصر کے طلبہ اور تعلیم یافتہ نوجوان یا تو زمیندار اور تجارت پیشہ طبقے کے

ہیں یا سرکاری افسروں کی اولادیں اور نئی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ دنیا کا تازہ ترین ادب اور سیاسی خیالات ان کے مطالعے میں آتا رہتا ہے، چنانچہ ان کے سامنے ایک نئی دنیا ہوتی ہے جسے وہ پیار بھی کرتا ہے اور اس سے نفرت بھی۔ ہر ہوائی جہاز جو قاہرہ کے اڈے پر اُترتا ہے تعلیم یافتہ مصری کے لئے کچھ نہ کچھ نئی چیز لیکر آتا ہے اور اس کا قومی و ذاتی انتشار اس سے اور بڑھ جاتا ہے۔ وہ اپنے دماغ سے نئے خیالات کو نکال نہیں سکتا! وہ مصر کی خرابیوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے کیونکہ مصر کے غربا اور دیہات کی حالت زار برداشت نہیں کرسکتا، مگر اس اصلاح میں خود اس کے قدامت پرست گھر والے مُخل ہوتے ہیں۔ یہ حالت اسے کرب و غضب میں مبتلا رکھتی ہے اور وہ احتجاج کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسے غیر ملکیوں سے نفرت ہے مگر وہ مصری پاشا سے بھی نفرت کرتا ہے۔ وہ عمل کا طالب ہے! دراصل وہ نہیں بتا سکتا کہ وہ کیا چاہتا ہے مگر یہ وہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نہیں چاہتا! اسی لئے وہ کمیونزم کو اپنا لیتا ہے۔ لیکن اصلاً مصری نوجوان وطن پرست ہے۔ وطن عزیز کو ترقی کی راہ میں تیزی سے گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ اسی لئے غم و غصہ دل میں لئے "مرتا کیا نہ کرتا" پر عمل کرنے لگتا ہے۔

یہ حقیقت نہایت اہم ہے کہ اس ملک میں جو اسلام کا قلعہ ہے، ایسے نوجوان موجود ہیں جو اپنے باپ کو چور اور ڈاکو کے نام سے یاد کرنے میں باک نہیں کرتے۔ اور ایسے باپ بھی موجود ہیں جو اپنے بیٹے کو مصر کی حالت پر اظہار خیال کرتے سنتے ہیں تو "ناپختہ جوانی کی بکواس" کہکر ٹال دیتے ہیں، یا اپنے لختِ جگر کے ان "عجیب خیالات" پر کڑھتے رہتے ہیں۔

ایسی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ذکی الحس بیٹے نے اپنے باپ کی دولت کو پس پشت ڈالکر راحت و آرام کی زندگی بسر کرنا ترک کردی ہے۔ اور ایسے نوجوان بھی ہیں جو "زمیندار کا ناس!" "افلاس کو ختم کرو!" "سرمایہ داری ختم کرو!" "نابرابری کو مٹادو!" قسم کے نعروں میں بہت دلکشی پاتے اور ہر انقلاب و طوفان کو "خوش آمدید!" کہنے کو طیار ہیں، بشرطیکہ وہ مصر کے ان خوابوں کو حقیقت میں بدلدینے کے لئے ہو! میں نے چند نوجوانوں سے سوال کیا:۔

"تم لوگ روس کی تقلید کرنا چاہتے ہو یا امریکہ کی؟"

"کسی کی نہیں! ہم یہ چاہتے ہیں کہ مصر اپنی کامل خود مختاری کی حفاظت کرے، لیکن ہم نہیں چاہتے کہ مصری پاشا اپنے قانون داں گرگوں کو پارلیمنٹ کے ممبر بنواکر مصری قوم کی قوت، اسکی صلاحیت اور قابلیت کو غیر کا پابند بنادیں!"

قانون کے ایک طالب علم نے مجھے جواب دیا۔

"مصر کی نئی نسل شدید قسم کی وطن پرست ہے، اور مشکلوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کو نہایت عزیز رکھتی ہے اور خوفزدہ ہے کہ کوئی ایسی صورت پیدا نہ ہو جائے کہ کوئی مشرقی یا مغربی طاقت کسی بہانے مصر کو پھر دبوچ لے۔ اس لئے یہ لوگ لفظ انقلاب سے بھی ڈرتے ہیں۔"

حکومت مصر نے ہفتہ وار الجمہور کو کچل دینے کی کوشش کی تھی جسے ایک نوجوان پروفیسر اور کئی قانون داں اور طلبہ ایڈٹ کرتے ہیں مگر وہ زندہ رہا اور جب مصر نے اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کی تو وہ تنہا اخبار تھا جس نے اس جنگ کی تنہا مخالفت کی۔ مصر کے طلبہ در در جاکر اس اخبار کو بیچتے اور چندہ وصول کرتے ہیں۔ مزدور لیڈروں سے اسے مدد ملتی ہے۔ حالانکہ مصر میں مزدور تحریک اس مفہوم میں موجود نہیں جو یورپ کے ملکوں میں لیا جاتا ہے۔ مجھے ایک سفارت خانے کے اٹیچی نے بتایا کہ:-

"جس وقت فرانس میں انقلاب ہوا تو فرانس موجودہ مصر کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ ملک تھا۔"

وزارت کے ایک ذمہ دار افسر نے جسے کالج چھوڑے زیادہ مدت نہ ہوئی تھی۔ غمگین آواز میں مجھ سے اعتراف کیا کہ

"ہٹلر اگر لڑائی میں جیت جاتا تو مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ فاشزم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔"

یہ اس نے صحیح کہا۔ کچھ دنوں کے لئے "نوجوان مصر" کی تحریک اٹھی تھی اور چند ہی دنوں میں کافی مدد حاصل کرلی تھی۔ اس کا طاقتور پریس بھی وجود میں آگیا تھا۔ مگر اتحادیوں کی فتح نے اس تحریک کو ٹھنڈا کردیا۔ تحریک ختم ہوگئی مگر اس کی اسپرٹ ابھی باقی ہے۔ اس اسپرٹ نے حال میں نیا روپ اختیار کرلیا ہے اور فلسطین کا مسئلہ اس کا بنیادی پتھر ہے۔

"اخوتِ اسلامی" سنہ ۲۸ء سے قایم ہے۔ ایک لاکھ ممبر ہیں جس میں دس ہزار مجاہدوں کی فوج ہے اس جماعت کو غیر ملکیوں سے سخت مخالفت ہے اور مذہبی قدامت پرستی اس کا نصب العین ہے۔ اگر وہ بولشیوک کا دشمن ہے تو اسی کے ساتھ جمہوریت کا بھی ہے۔ وہ عرب ملکوں کا اتحاد چاہتی ہے اور مصر کی سیادت چاہتی ہے۔

الحاصل یہاں قدامت پرستی اور جدت پسندی کا معرکہ قایم ہے۔ شیپرڈ ہوٹل کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا تو میں نے دیکھا کہ جنازے پر ایک جامنی رنگ کی چادر پڑی تھی اور سرہانے ایک طربوش (ترکی ٹوپی) رکھی تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ مرنے والا صاحب اثر و رسوخ تھا۔ میت کے پیچھے سیاہ برقعے ڈالے عورتیں بین و بکا کرتی جارہی تھیں۔ یہ سب قدامت پرستی کے آثار تھے اور ان کے ساتھ ایک بینڈ باجہ FUNERAL MARCH کا CHOPAN بجاتا جارہا تھا۔ یہ نئے تمدن کی علامت تھی۔

---

# نواں باب

## (مصر، عالمِ نزع میں)

مصری کسان کا سب سے زیادہ عزیز سرمایہ اس کی بھینس ہے جو دودھ دینے کے ساتھ ہل چلانے کا کام بھی دیتی ہے۔ مصر کی رائل اگریکلچرل سوسائٹی نے ایک نمونے کا گاؤں آباد کیا ہے۔ اس گاؤں میں مینے پہلی دفعہ دیکھا کہ بھینس ایک الگ کمرے میں بندھی تھی، ورنہ کاشتکار اس کو اسی کمرے میں باندھتا ہے جس میں خود رہتا ہے، اس لئے کہ وہ اس کو سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہے۔ یہ بھینس شمالی امریکہ کی گائے کے مقابلے میں صرف پانچواں حصہ دودھ دیتی ہے۔ مگر اس کی یہ بھینس ایک اور کام بھی دیتی ہے اور وہ یہ کہ کسان کے بچے اس کے ساتھ کھیل کود لیتے ہیں اور تالاب میں اس کو نہلانے کے وقت خوب خوش ہوتے ہیں۔

مصر میں کسانوں کے تیس لاکھ کنبے ہیں مگر بھینسوں کی گنتی صرف پندرہ لاکھ ہے، اس لئے بعض کسان دودھ کے لئے بکری پال لیتے ہیں اور باقی جو زیادہ خرچ نہیں کر سکتے، بغیر دودھ ہی کے جیتے ہیں۔ مصریوں نے ابھی دودھ کی خاطر گائے پالنا نہیں سیکھا اور اس کے دودھ کے فواید سے واقف نہیں ہیں۔

مویشی کی یہ کمی مصر کا ایک قومی مسئلہ ہے۔ کیونکہ مصریوں کو دودھ نصیب نہیں ہوتا، ڈنمارک میں اگر دودھ کی سپلائی اٹھائیس ہے تو مصر میں صرف ایک ہے۔ مصری کسانوں کی ادنیٰ اور گری ہوئی صحت کی وجہ یہ بھی ہے کہ انھیں دودھ نصیب نہیں۔

کسان عورتیں اگر اپنے بچوں کو دودھ نہیں دے سکتیں تو انھیں ہر وقت اُدھنتی رہنے والی سیاہ چائے پلاتی ہیں۔ اور چائے کی یہ عادت مصری کسانوں میں اتنی بڑھ گئی ہے کہ وہ اس کے لئے اپنی قمیص بھی گرو کر سکتا ہے۔

پونے دو کرور کے قریب آبادی رکھنے والا مصر، صرف پچیس لاکھ ایکڑ زمین کاشت کرتا ہے۔ اور یہ زمین نیل کی طغیانیوں کے باعث دنیا میں سب سے زیادہ زرخیز زمین ہے۔ دنیا کی کسی قوم کی ہستی کا انحصار دریا پر اتنا نہیں ہے، جتنا مصری قوم کا دریائے نیل پر اور دنیا کا کوئی ملک اپنی زرخیزی کے لئے کسی دریا کا اس قدر ممنون نہیں جتنا مصر نیل کا ہے۔ نیل نہ ہوتا تو دنیا میں قدیم و جدید مصر وجود ہی میں نہ آتا۔

مصری آب و ہوا خشک ہے اور وہاں اوسط بارش بہت کم ہے۔ اس لئے ہر قطعۂ زمین آبپاشی چاہتا ہے۔ پچیس فیصدی زمین کی آبپاشی تو نیل کی طغیانی سے پوری ہو جاتی ہے باقی کے لئے نہری آبپاشی کا انتظام ہے۔ یہ نہری آبپاشی محمد علی پاشا (۱۷۶۹ء لغایت ۱۸۴۹ء) کی کوشش کا نتیجہ ہے کہ برطانیہ نے بھی آبپاشی کے ذرائع بڑھانے میں مدد کی ہے اور اسوآن کا بند برٹش اسکیم ہی کا نتیجہ ہے۔

نیل کی طرح دوسری نعمت مصریوں کے لئے سورج ہے۔ مسلسل دس گھنٹے کی دھوپ مصر کی زمین کے لئے ایک نعمت ہے۔ پانی کی افراط اور دھوپ دونوں ملکر مصر کو قحط سالی سے بچاتے رہتے ہیں یہاں کی زمین ہر قسم کی کاشت کے لئے مناسب ہے۔ روئی تو مصر کا سونا ہے، گو قابل زراعت زمین کے صرف پانچویں حصے میں کپاس بوئی جاتی ہے، لیکن برآمد میں روئی کا اوسط اسی فیصدی رہتا ہے۔ کیونکہ وہاں کی روئی دنیا بھر کی روئی سے بہتر سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کی ترکاریاں، پھل اور غلہ بھی بہتر ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود مصری کسان بھوکا، ننگا اور بیمار رہتا ہے۔

مصر میں میں نے پر شوکت اہرام بھی دیکھے، عظمت آفریں ابوالہول کو بھی دیکھا۔ عجائب خانے میں اعلیٰ صناعی کے نمونے بھی دیکھے، اور ہر منظر نے میرے اندر حیرت و استعجاب کی لہر دوڑا دی" لیکن جب میں نے مصر کے گاؤں دیکھے تو قدیم و جدید مصر کی عظمتیں میرے ذہن و خیال سے محو ہوگئیں۔

مصری کسان کچے مکان میں رہتا ہے جو بدوضع بھی ہوتا ہے۔ ورنہ مٹی گارے کے مکان بھی خوبصورت اور آرام دہ بنائے جا سکتے ہیں۔ ایگریکلچرل سوسائٹی نے نمونے کے گاؤں میں نہایت خوبصورت اور آرام دہ مکان بنوائے ہیں جو گرمی میں سرد اور سردی میں گرم رہتے ہیں۔ مویشی باندھنے کا اصطبل رہنے کے کمرے سے الگ بنایا ہے۔ قبل جنگ اس مکان کی لاگت سو امریکن ڈالر کے برابر تھی اور مصری کسان کے لئے یہ رقم بہت بڑی رقم تھی۔ لڑائی کے بعد کی گرانی میں تو اس کے لئے یہ مکان حاصل کرنا ناممکن سا ہے۔ جو مکان وہ بناتا ہے بہت سستے میں بن جاتا ہے۔ مٹی مفت اور سرکنڈے وغیرہ بھی نہایت ارزاں، اور یہی دو چیزیں اس کی تعمیر کا مسالا ہیں۔ مکان نہایت بدبودار ہوتا ہے اور مکھیوں کی انتہا نہیں۔ موسم البتہ مصری کسان کا دوست ہے اور وہ چوبیس گھنٹے سے زیادہ کھلے میں بسر

کرتا ہے۔

مصر کے دیہاتی پینے کا پانی تالابوں سے حاصل کرتے ہیں جن میں بچے اور مویشی نہاتے بھی ہیں۔ پانی کے گھونگے ایک خاص بیماری کا ذریعہ بنتے ہیں۔ دیہاتی لوگ جوتہ پہننے والے کو دولتمند سمجھتے ہیں مرد اور بچوں کو کپڑا بہت کم نصیب ہے۔ البتہ عورت کا لباس غنیمت ہوتا ہے۔ دیہاتی عورت پردہ نہیں کرتی لیکن اس کی عصمت و پاکبازی کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔

دُنیا میں دیہات کے لوگ اس قدر مریض و بیمار کہیں کے نہ ہوں گے جتنے مصر کے ہیں۔ آنکھوں کی بیماری بہت عام ہے اسی لئے وہاں اندھوں کا اوسط سب ملکوں سے زیادہ ہے۔ ملیریا اور گھونگے سے پیدا ہونے والی بیماری جس کا نام "ملہارزیا" پڑ گیا ہے عام ہے۔ ستر، اسی فیصدی کسان اس بیماری اور داد کے مریض ہیں۔

مصر کے دیہاتی بچے اتنے ہی چونچال اور کھلنڈرے ہیں جتنے کسی دوسرے ملک کے ہو سکتے ہیں۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ سرخ و مریض آنکھیں اور سوجے چہرے پر مکھیاں کھیل کے وقت بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مصری کسان کا افلاس و جہالت اس حد تک ہے کہ وہ ارزاں ترین دوائیں بھی خرید کر اپنے بچوں کی آنکھیں نہیں دھو سکتا۔

الغرض دُنیا بھر کے ملکوں سے بہتر آب و ہوا کا مالک اور دُنیا بھر میں سب سے زیادہ زرخیز زمین کا مالک ہوتے ہوئے بھی، مصر میں افلاس کی انتہا نہیں ہے۔

ایک مصری ماہر زراعت کے ساتھ مجھے ایک مرتبہ قاہرہ سے ذرا دور ایک گاؤں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ بازار میں وہ کسی شناسا سے بات کرنے لگا اور میں ایک صحن میں داخل ہو گیا۔ فوراً میں نے اپنے دوست کو پکارتے سُنا کہ "واپس آجاؤ!" پھر اس نے معذرت کے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس طرح کسی مکان میں داخل ہو جانا خطرے سے خالی نہیں۔ میں نے کہا کہ دن دہاڑے اور آدمیوں کی موجودگی میں میرے داخل ہونے پر کوئی شک شبہ کیسے کر سکتا ہے تو اس نے بتایا کہ مصری لوگ جلدی شک کر لیتے ہیں اور جلد مشتعل ہو جاتے ہیں۔ پھر اس نے بتایا کہ مصر میں قتل کی وارداتیں دیہات ہی میں زیادہ ہوتی ہیں اور اس کی وجہ بیشتر یہی بدگمانی ہوتی ہے۔

مصر میں تعدد ازدواج برائے نام ہے مگر شک کی بنا پر طلاق کی کثرت ہے یہ بھی مصریوں کی بدنصیبیوں میں سے ایک بدنصیبی ہے۔

مصر کے لوگ کافی تغذیہ نہ ہونے کے باعث کمزور ہیں اور چونکہ اپنی قوت مردمی کے بارے میں

نہایت ذکی الحس بھی اس لئے حشیش کا استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

اپنی ان کمزوریوں کے باوجود، دُنیا بھر کے کسانوں کی طرح، مصری کسان میں خوبیاں بھی ہیں۔ وہ عام مصریوں کی طرح غیر ملکیوں کو ناپسند کرتا ہے، وہ ایرانی کسان کی طرح زود آمیز بھی نہیں لیکن آپ سے تھوڑی شناسائی بھی ہو تو اس کی کم گوئی ختم ہو جاتی ہے اور وہ کھل کر باتیں کرتا ہے۔ دوسرے ملکوں کے حالات کے متعلق سوالات کرتا ہے۔

مسلمہ طور پر مصر کے لوگ جلدی مشتعل ہو جانے والے ہیں لیکن مصری کسان اجنبیوں کے سامنے برد بار اور خلیق ثابت ہوتا ہے۔ وہ دوسرے فلاح کے کھیتی باڑی کے کام میں بوقت ضرورت عملی مدد دینے کو ہر وقت آمادہ رہتا ہے۔ وہ اپنے بچّوں سے محبّت کرتا اور انھیں شفقت سے رکھتا ہے۔ طلاق کا رواج عام ہے مگر بیوی سے اُلفت کرتا اور اس کا احترام ملحوظ رکھتا ہے۔ اسے فطرت سے بھی محبّت ہے اپنی زمین سے بھی وابستہ ہے اور اس کی سب سے بڑی خواہش ایک قطعہ زمین کا مالک بنجانا ہے؟ وہ محنت کرتا اور بار برداری کے مویشی کی طرح ہر وقت جُتا رہتا ہے۔ اس کی زندگی میں مسرت برائے نام اور امید مفقود ہے۔ دودھ، گوشت، انڈا، مچھلی وغیرہ اس کی غذا کا جزو نہیں۔ ہر وقت اونٹتی رہنے والی چائے اس کی سب سے بڑی عشرت ہے۔ چائے میں کبھی شکر ہوتی ہے اور کبھی نہیں۔ مٹی کا تیل، صابن اور کپڑا بس اسی حد تک خرید سکتا ہے۔ جتنی اس کی قلیل آمدنی، چائے اور شکر کے صرف کے بعد اجازت دیتی ہے۔ وہ درحقیقت بے والی وارث ہے، وہ محض فطرت کے رحم پر جیتا ہے صرف ایک سورج ہے جو اس کا دوست ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصری فلاح مصر کی شان و عظمت ہے اور اسی کی قوت بازو سے مصر کی خوشحالی قایم ہے، مگر اسی کے ساتھ وہ مصر کی ٹریجڈی بھی ہے۔

شاہ مصر نے، سماجی بہبود کے لئے تعلیم یافتہ جماعت اور سیاسی لیڈروں نے جہالت، افلاس اور بیماریوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ یہ نعرہ میں نے ہر جگہ سنا اور یہ بھی دیکھا کہ بعض زمیندار کچھ رفاہی کام کر رہے ہیں، مگر یہ کام تو قومی عمل اور قومی ارادے ہی سے انجام پا سکتا ہے، جو یہاں مفقود ہے۔

مصر کے افلاس کی بنیاد اس کی کثرت آبادی بتائی گئی ہے اور اس موضوع پر بہت سی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ دُنیا کے کثیر آبادی رکھنے والے ملکوں میں ایک مصر بھی ہے۔ مصر کا علاقہ ویسے تو تین لاکھ چھیاسی ہزار میل مربع ہے، لیکن قابل زراعت زمین صرف ساڑھے تین فیصدی ہے۔ باقی سب صحرا ہے۔ چھ ہزار سال پہلے جس طرح وہ محض نیل کے ذریعہ سے رزق حاصل کرتا تھا اسی طرح آج بھی حاصل

کر رہا ہے۔ نیل کی لمبائی نو سو ساٹھ میل ہے اور ساری آبادی اس کے کنارے پر ہے۔ اس دریا میں کوئی دوسری ندی آکر گرتی بھی نہیں ہے۔ یہ حقیقت کہ صرف چھپن لاکھ ایکڑ زیر کاشت ہے اور دو لاکھ ایکڑ مزید زیر کاشت لائی جا سکتی ہے، اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ مصر کی زمین پر اس کی آبادی کا بڑا زبردست بار ہے۔ بلجیم بھی کثیر آبادی کا ملک ہے مگر وہاں فی کیلو میٹر صرف دو سو چھیاسٹھ آدمی ہیں اور مصر میں پانچسو تینتیس۔

اس مشکل کا حل سوڈان کی طرف ہجرت کرنا سمجھا گیا ہے، لیکن خود سوڈان کا مسئلہ ہنوز لاینحل ہے اور اس ذیل میں ابتک کوئی کام نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی کوئی امید ہو سکتی ہے۔ افزائش نسل پر کنٹرول، یہاں شاید قابل عمل نہ ہو کیونکہ مصری کسان خیال کرتا ہے کہ جتنے بچے ہوں گے اتنے ہی کام کرنے والے بڑھیں گے۔

اعداد و شمار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک کنبہ چار ایکڑ زمین پر بخوبی کاشت کر سکتا ہے۔ اس لئے اس حساب سے آدھے مصری کسان نکمے اور فالتو ہو جاتے ہیں۔ اس فالتو آبادی کو وہ عراق منتقل کرنے کی سوچ رہے ہیں۔ مگر اس کام کے لئے ابھی پہلے بہت کچھ کرلینا ہے۔

اس کے علاوہ مصر میں صنعت بڑھانے کی تجویز بھی سوچی جا رہی ہے۔ لیکن اس کے لئے یہاں خام پیداوار کی کمی ہے۔ اس سے قطع نظر صنعتی پھیلاؤ کے لئے منڈی کی ضرورت ہوتی ہے اور ہر صنعت کی سب سے پہلی منڈی خود اپنا ملک ہوتا ہے، مگر مصر اس باب میں بھی بدقسمت ہے کیونکہ اس کے کسانوں کے پاس پیسہ نہیں ہے۔ قانون آراضی کی اصلاح ہو تو کسان کی آمدنی بڑھے اور اس کا مصر میں چرچا بھی نہیں ہے۔

اعداد و شمار سے ثابت ہے کہ مصر کے ساڑھے سترہ لاکھ کسانوں کے پاس صرف ساڑھے سات لاکھ ایکڑ اور بارہ ہزار دو سو زمینداروں کے قبضے میں اس سے ساڑھے تین گنی آراضی ہے۔ یہ بھیانک حقیقت مصر کی سماجی اور اقتصادی زندگی کے مطلع کو مکدر بنائے ہوئے ہے۔ سرزمین مصر جس طرح زمیندار کے لئے جنت ہے جس میں وہ عیش و مسرت کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسی طرح وہاں کے کسان کے لئے دوزخ ہے، جہاں افلاس و بیماری کے سوا کچھ نہیں۔

**جنوری، فروری ۱۹۴۸ء** (پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر۔ جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقایق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دورِ زریں اور ان کارناموں کو نہ بھول جائے جن پر مسلم حکومتوں کی ترقی کی بنیاد قایم ہوئی تھی۔ تمام مقالات اڈیٹر کے قلم کے ہیں۔ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول۔ منیجر نگار

# دسواں باب

## (زرعی اصلاحات یا تباہی)

میں جنگ کے دنوں میں بالائے نیل، لکسر میں تھا، تو ایک قبطی ڈاکٹر نے مجھے ایک بہت بڑے پاشا زمیندار سے ملایا جو تبدیل آب و ہوا کے لئے ونٹر پیلیس ہوٹل میں مقیم تھا۔ پاشا کی سرخ طربوش اور اس کا بنتا ہوا سیاہ ریشمی پھندنا بڑا مرعوب کن تھا۔ ٹائی پن کا چمکیلا ہیرا اور اس سے بڑا انگوٹھی کا دمکتا ہوا ہیرا اسکی دولتمندی کو ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا بہترین انگریزی لباس اور فصیح انگریزی اور فرانسیسی گفتگو اس کی تہذیب و تعلیم کا ثبوت تھے۔ وہ بے انتہا متواضع اور حد درجہ شایستہ و سنجیدہ تھا۔

اس پاشا نے انگلستان اور فرانس میں تعلیم پائی تھی اور امریکہ کی سیاحت کر چکا تھا۔ اپنی سیاحت کے اذکار بڑے جوش و انہماک کے ساتھ سناتا رہا، ایک پر جوش وطن پرست کی طرح مصریوں کی حالت زار کا ذمہ دار وہ برٹش حکومت کو سمجھتا تھا، جو مصر کے اقتصاد، کلچر اور جینیس کا گلا گھونٹتے رہے ہیں، اس نے کہا کہ اگر انگریز، مصر و سوڈان سے چلے جائیں تو مصر اپنی پرانی شان و عظمت کو پھر سے زندہ کر سکتا ہے۔

یہ باتیں میں نے مصر میں ہر ایک کی زبان سے سنی تھیں۔ اس لئے میں نے اس سے ایک سیدھا سا سوال کیا، "کیا انگریزوں نے مصریوں کو زرعی اصلاحات سے روکا ہے؟" اس نے تسلیم کیا کہ نہیں روکا ہے، تو پھر میں نے دوسرا سوال کیا۔ "پھر قانون آراضی میں اصلاح کیوں نہیں ہوئی؟" اسکے جواب میں اس نے یہ ٹالنے والا جواب دیا کہ: "یہ بلند قسم کی سیاست ہے!" میں نے اُسے توجہ دلائی کہ: "کیا برطانوی عقل و فراست، برطانوی سرمایہ، برطانوی رہنمائی نے مصر کو اور خاص پاشا کو غیر معمولی دولتمند نہیں بنا دیا ہے؟" تو اس نے جواب دیا کہ: "برطانیہ نے ان باتوں کا کافی معاوضہ بھی پا لیا ہے"۔

حقیقت امر یہ ہے کہ برٹش مداخلت کے خلاف ایجی ٹیشن کرنے سے سوڈان کو مصر سے ملا دینے کی پکار ہر

اور اسرائیل کے خلاف جنگ شروع کر دینے سے مصریوں کا جذبۂ قوم پرستی بہت زیادہ اُبھار دیا گیا ہے۔ اس سے اصل مقصد پورا ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، مگر مصری قوم اپنی مصیبتوں کو ضرور بھول گئی ہے۔ نہر سوئیز کے کنارے کے علاوہ انگریزوں نے مصر خالی کر دیا ہے مگر مصری کسان کو کوئی سہولت نہیں مل پائی ہے، اس کی مفلسی اتنی ہی شدید ہے، اس کی بیماریاں وہی ہیں اور مصر کا تعلیم یافتہ طبقہ اسی طرح بے روزگار ہے۔

جب ہم ہوٹل سے نکل رہے تھے تو میرے ڈاکٹر دوست نے بتایا کہ حال ہی میں ملیریا کی وبا نے ایک لاکھ جانیں تلف کی ہیں۔ اس بیماری کے مچھر ہوائی جہازوں کے ذریعہ مغربی افریقہ پہونچے اور مصریوں میں تاب مقاومت تھی نہیں اس لئے وبا پوری طرح پھیل گئی۔

میں اس ڈاکٹر سے مصریوں کے مفلس اور مریض رہنے پر بات چیت کرتا رہا مگر میں نے دیکھا کہ وہ کھل کر اظہار خیال نہیں کر رہا ہے کیونکہ وہ مذہباً عیسائی تھا۔ میرے اس کہنے پر کہ آخر ہے تو وہ بھی مصری اس نے شد و مد کے ساتھ کہا کہ وہ "بے میل مصری ہے!" پھر اس نے بتایا کہ:-

"اس پاشا کی طرح کے لوگوں نے مصر کی ترقی روک رکھی ہے۔ اس کے پاس دولت ہے اور جس طرح آپ نے دیکھا، عیش و عشرت میں پڑے ہیں۔"

اس قبطی ڈاکٹر کے خیالات و احساسات بھی وہی تھے جو بے شمار دوسرے مسلمان مصریوں میں پائے جاتے ہیں۔ ترقی پسند خیالات رکھنے والے مصری بخوبی سمجھتے ہیں کہ صرف قوم پرستی کا نشہ سماجی اصلاح نہیں کر سکتا اور سمجھتے ہیں کہ مصر کی اقتصادی تباہ حالی میں ان پاشاؤں کی عیش پرستی کو بڑا دخل ہے۔ زیادہ مدت قایم نہیں رہ سکتی۔

وہ مصری جنھیں زراعت کی تعلیم ملی ہے بخوبی جانتے کہ مصر اپنی روئی کی پیداوار پر انحصار کر کے بیٹھا رہے۔ حالات زمانہ بدل رہے ہیں اور ایک دن آئے گا کہ مصری روئی بہت اعلیٰ ہونے کے باوجود دنیا کی منڈیوں میں نہیں بکے گی۔ جس طرح روس اور برازیل وغیرہ نے اپنی زرعی پیداوار کا رخ بدل دیا ہے، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ مصر بھی ایسا ہی کرے۔

ایک امریکن ماہر نے مصر کی کاشت کا مطالعہ کرنے کے بعد کہا ہے کہ:-

"مصر کو روئی اور گیہوں کی کاشت گھٹا کر پھلوں کی کاشت بڑھانا چاہئے۔ مصر کی زمین اور آب و ہوا اسے یورپ کا کیلیفورنیا بنا دے گی۔ لیکن جب تک قانون آراضی نہ بدلا جائے مصر کے لئے ایسا کرنا مشکل ہوگا۔"

بلاشبہ مصر، یورپ کا کیلیفورنیا بن سکتا ہے اور ایسا ہونا مصری فلاح کے لئے نئی امیدوں کا ضامن

بن جائے گا- لیکن اس غریب کو تو بیماریوں نے معذور بنا رکھا ہے۔

مصر کے زرعی سائنسداں اپنے ملک کی بہبود کے لئے بہت کچھ اور بھی سوچ رہے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ڈیری فارم، شہد اور مرغی خانے وغیرہ کی انڈسٹری کو دیہات میں بڑھانا مصری فلاح کے افلاس کو کم کر دے گا اور اس کی غذا بھی بہتر ہو جائے گی۔

مصر میں ہر دس بارہ آدمیوں کے پیچھے ایک دودھ کا جانور ہے، امریکہ میں ہر پانچ آدمیوں کے لئے ایک - لیکن مصری اور امریکن مویشی کے دودھ دینے کی استعداد پر نظر کی جائے تو یہ فرق بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔

مصر نے امریکہ کے مختلف قسم کے انگوروں کی کاشت کی - یہ انگور اتنے اچھے تو نہ ہو سکے لیکن یورپ میں ان کی مانگ ہو گئی - اسی طرح کھجور، انجیر اور کیلے کی پیداوار بڑھائی جا سکتی ہے - پھلوں کے علاوہ پھولوں خاصکر گلاب کے پھولوں کی کاشت کر کے برآمد کی جا سکتی ہے۔

مصر کے تمام روشن خیال لوگ متفق الخیال ہیں کہ قانون آراضی کی اصلاح لازمی و لابدی ہے۔

حکومت مصر نے ایک وزارت سماجی بہبود کے کاموں کے لئے قایم کر رکھی ہے - اس وزارت کا ایک محکمہ فلاح کے بہبود کے لئے قایم کیا ہے - اس کا انچارج ڈاکٹر احمد حسین ہے - میں نے اس کی بہت تعریفیں سنیں تو اس سے ملا بھی - اور ان تعریفوں میں کوئی مبالغہ نہ پایا - ڈاکٹر حسین اپنا سارا وقت اور ساری قوت دیہاتی زندگی اور دیہاتی مسایل کے سمجھنے میں صرف کرتا ہے، اور بلاشبہ ان مسایل پر عبور رکھنے والا دوسرا آدمی مصر میں نہیں ہے - پورے قاہرہ میں وہ سب سے زیادہ مصروف آدمی ہے وہ کھل کے گفتگو کرتا ہے اور جتنی صاف گوئی سے بات کرتا ہے اتنا ہی صاف سوچتا بھی ہے، اور پھر اسی شدت سے اس پر عمل بھی کرتا ہے - حسین سخت قسم کا حقیقت پرست انسان ہے، اور یہی نہیں کہ وہ صرف دیہی مسایل کو سمجھتا ہے بلکہ مصری تعلیم یافتہ طبقے کے محسوسات و خیالات کو بھی اچھی طرح جانتا ہے اس کی نظر کسان کی مصیبت اور تعلیم یافتہ مصریوں کی بغاوت، دونوں پر ہے اور ان دونوں کا باہمی تعلق اس کے پیش نظر ہے - گفتگو کرتے ہوئے بولا :-

"ہم اپنی قوم کو اقتصادی بے بسی اور امراض میں مبتلا رکھنا چاہیں بھی تو نہیں رکھ سکتے - بلاشبہ مصر کو یورپ کا کیلیفورنیا بننا چاہئے - اس کی ہمیں اشد ضرورت ہے کیونکہ اس سے مصری عوام کی غریبی دور ہو گی - لیکن اس کام کے لئے دو اصلاحیں لازمی ہیں : ایک کاشتکاری کے طریقوں میں اور دوسری آراضی کی ملکیت کے قانون میں - دو لاکھ ایکڑ پر روئی کی کاشت کے بدلے باغ لگائے جائیں اور سخت محنت کی جائے تو اکثر

دیہاتی بیروزگاروں کو روزگار مل سکتا ہے، لیکن زمینداریا شاؤں کو اس پر آمادہ کرنا اور پرانے طریقے کو چھوڑنا مشکل کام ہے تاہم اگر مصریوں کی بھوک اور بیماری دور کرنا ہے تو مخالفت کی پروانہ کرکے قانون آراضی میں تبدیلیاں کرنا لازم ہے۔ بیس لاکھ ایکڑ نئی زمین کو قابل کاشت بنانا ہے۔ یہ آراضی صرف ایسے کاشتکاروں کو دیجائے گی جن کے پاس اپنی زمین نہیں ہے، اور کسی کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین کی ملکیت کا حق نہ ہوگا پرانے زمینداروں کے پاس اگر سو ایکڑ سے زیادہ زمین ہے تو انکو اسکی آمدنی پر سو فیصدی ٹیکس ادا کرنا ہوگا۔ اسکے بعد زمیندار کو سو ایکڑ سے زیادہ زمین رکھنا فایدہ بخش نہ ہوگا اور وہ از خود حکومت کے ہاتھ بیچ ڈالیگا۔ سو ایکڑ زمین کی آمدنی سے یہ لوگ فارغ البالی کی زندگی گزار سکیں گے۔ فالتو زمین کی جو قیمت انکو حکومت سے ملیگی وہ خاص کر گھریلو انڈسٹری میں لگے گی جہاں ملکی ضرورت کا سامان طیار ہوگا ـــــ کسان جب اپنی آراضی کا خود مالک ہوگا تو اس کی آمدنی میں اضافہ اور زندگی کا معیار اونچا ہوگا، اور وہ گھریلو دستکاریوں کی پیداوار خرید کر استعمال کرسکے گا۔ چونکہ مصری کسان کو اپنی آراضی سے عشق ہے اور اس کی زندگی و مسرت آراضی ہی سے وابستہ ہے، اس لئے پیداوار میں ترقی لازمی ہوگی۔ بلاشبہ اسے آراضی کو بہتر بنانے کی تعلیم دیجائے گی، یہ محکمہ اسی کام کے لئے قایم ہے۔ ہمیں کامل یقین ہے کہ غریب کسان بہتر زندگی کا سخت آرزومند ہے، اس لئے وہ ہماری تعلیم کو لازماً قبول کرے گا۔"

میرے اس سوال کے جواب میں کہ ان اصلاحات کو قانون کی صورت دینے کے بعد بھی کثرت آبادی کا مسئلہ باقی رہے گا، اس نے جواب دیا:۔

"ٹھیک ہے! لیکن ہم ہر کام ایک ساتھ شروع نہیں کرسکتے۔ میں ڈکٹیٹری کا قایل نہیں اور تدریجی ارتقاء کو مانتا ہوں۔ ہمارے نوجوان انقلاب لانے کے لئے بے چین ہیں مگر میں تدریجی ترقی کو مناسب سمجھتا ہوں کہ ہماری تعلیمی ترقی کی اسکیم فلاحین کے اخلاقی اصلاح میں ہماری مدد کرے گی۔ ہم نے اس کی ابتدا کردی ہے۔ اسکولوں میں پانچ لاکھ بچوں کو دن کا کھانا مفت دیا جاتا ہے ـــــ دیہات میں کلب اور سوشل سنیٹر کھولے جارہے ہیں۔ گھریلو دستکاریاں پھیلائی جارہی ہیں۔ سولہ ہزار کوآپریٹو سوسائٹیاں کام کررہی ہیں۔ اس طرح ہم دیہات میں سماجی زندگی پیدا کررہے ہیں اور کرتے جائیں گے۔" میرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ:۔ "زرعی اصلاحات کے قانون کا مسودہ طیار ہوچکا ہے اور وزارت نے اسے منظور بھی کرلیا ہے۔ اصلاحات کی مخالفت کا زور بھی کم ہورہا ہے۔ اب ہمارے پروگرام کو "بولشوزم" نہیں کہا جاتا ہے۔"

آخر میں ڈاکٹر حسین نے کہا کہ "زمیندار یا تو سو ایکڑ زمین کی آمدنی پر قناعت کریں گے یا پھر چند روز اور عیش منالیں اور اس کے بعد اپنا سر قلم کرائیں!"

ڈاکٹر حسین کے یہ الفاظ میں نے مصر میں اس سے پہلے کسی کی زبان سے نہیں سنے تھے۔

# گیارھواں باب

## (نیا امتحان)

توریت میں آیا ہے کہ ابراہیمؑ کو خدا نے ترک وطن کی ہدایت کی اور وہ اپنے خاندان کو لیکر عراق سے نکلے کہ نئی چراگاہیں تلاش کریں۔ اس سے ابراہیمؑ کے شیخ قبیلہ ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔ توریت کا حوالہ اس زمانہ کے انسان کے لئے قصہ کہانی کا درجہ رکھتا ہے، مگر ۱۹۵۲ء کی دریافت نے ثابت کر دیا ہے کہ قدیم عراق کا مرکز شہر اُر تھا جو ایک شاندار تمدن کا حامل تھا۔ حضرت ابراہیم کا وطن یہی شہر اُر تھا، اسوقت کا عراق کلدانی قوم کا گہوارہ تھا اور اس قوم کے کلچری کارنامے ہزاروں سال سے اسی سرزمین میں مدفون تھے جن کو اب کھود کر نکالا جا رہا ہے۔

تین ہزار سال پہلے شہر اُر خلیج فارس پر ایک بندرگاہ تھا، مگر آج اس شہر کی زمین ساحل سے کوئی ڈیڑھ سو میل دور جا پڑی ہے۔ سمندر پیچھے ہٹتا رہا ہے۔ والٹر لوڈر ملک نے نتیجہ نکالا ہے کہ پچھلے سات ہزار برس کے اندر سرزمین عراق پر گیارہ مختلف تمدن وجود میں آئے اور فنا ہو گئے۔ ان مختلف تہذیبوں نے جو آج فنا کی گود میں سو رہی ہیں نوع انسان کی تاریخ کو بعض حرکت میں لانے والے واقعات سے سنوارا اور بعض امٹ کارناموں سے قوی بنایا ہے۔

راویوں کی زبان میں دوآبۂ دجلہ وفرات کی وادی انسانی تمدنوں کا گہوارہ ہے، اسی علاقے میں طوفانِ نوحؑ برپا ہوا اور مذہبی عبادت گاہیں قایم کرنے کا خیال سب سے پہلے اسی سرزمین پر پیدا ہوا۔ ایک امریکن مورخ نے جماعتی عبادتگاہ بنانے کا سہرا یہودیوں کے سر باندھا ہے جن کو شاہ بابل بخت نصر قیدی بنا کر اپنے پایۂ تخت بابل میں لایا تھا۔ قدیم بابل اور آج کا عراق ایک ہی چیزیں ہیں۔ بابل کے اس سیناگاگ (یہودیوں کی مسجد) نے یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں میں جماعتی عبادت کی بنیاد ڈالی۔

الف لیلہ کا بغداد، عراق کا مرکز ہے جہاں مسلمانوں نے ایک عظیم الشان اور نہایت طاقتور مملکت قایم کی تھی۔ عباسی خلافت کا مرکز و مستقر بغداد تھا جہاں معروف عام اور مقبول شہنشاہ ہارون رشید حکومت کرتا تھا۔ جس کی طاقت کا جواب اسوقت کی دُنیا میں نہ تھا۔

اس وقت کے عراق میں جیسی کاشت ہوتی تھی اس کی زرخیزی کی مثال یورپ اور ایشیا میں کہیں نہ ملتی تھی۔ کہاوت کے طور پر آتا ہے کہ زمین کریدنے سے فصل مسکرانے لگتی تھی۔ ہیروڈوٹس نے اس ملک کی زرخیزی کی بڑی تعریف لکھی ہے۔ ہیروڈوٹس کے علاوہ اس ملک کی زرخیزی کی شہادتیں دوسرے ذریعوں سے بھی ملتی ہیں، اور تصدیق ہوگئی ہے کہ پرانے زمانے کا عراق "نہروں سے چمکتا اور غلے کے انباروں سے معمور رہتا تھا"۔ آج کے مقابلہ میں قدیم عراق کی پیداوار تین گنی زیادہ تھی۔

خلیفہ ہارون رشید کے زمانہ میں شہر بغداد کی آبادی بیس لاکھ تھی، اور خوشحالی اور کلچری ترقی میں دُنیا کا کوئی پایۂ تخت بغداد کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ سر مارکس سائکس بغداد کا حال سُناتے ہوئے لکھتا ہے کہ:۔

> "شہنشاہی دربار شائستہ، شاندار اور بے حد متمول تھا۔ چاروں طرف شہر آباد تھا اور بیچ میں قلعہ تھا جہاں سے نظم و نسق کے احکام ہر وقت جاری ہوتے رہتے تھے۔ ہر چیز کا محکمہ جدا تھا اور دفتروں کی باقاعدگی اُسوقت کی دُنیا میں بے مثال تھی۔ شہر بغداد سب سے بڑی تجارتی منڈی تھا۔ تعلیم گاہوں کا شمار مشکل تھا۔ جہاں دُنیا بھر کے طلبہ، فلسفی، علماء اور شاعر آتے اور کسب علم کرتے تھے۔ دارالخلافہ کی طرح صوبائی مستقروں میں بھی عالیشان سرکاری عمارتیں تھیں۔ پوری مملکت میں ڈاک کا انتظام مکمل تھا۔ فوج وفادار، بہادر اور قاعدہ کی پابند تھی۔ گورنر اور وزراء، متدین اور بردبار ہوتے تھے۔ عباسی مملکت صقلیہ سے عدن تک اور مصر سے وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس وسیع مملکت میں نظم و نسق یکساں طور پر مضبوط تھا۔ سرکاری عہدوں پر عیسائی، یہودی، مسلم اور بے دین سبھی فایز ہوتے تھے۔ اس حکومت کے زمانہ میں جھوٹے پیغمبر، باغی جرنیل اور غاصب عمال یکسر مفقود ہوگئے تھے۔ تجارت کی وسعت اور دولت کی فراوانی نے قحط اور بغاوت کو دیس سے نکال دیا تھا۔ وباء اور امراض کی روک تھام کے لئے سرکاری اسپتال اور شاہی معالج تھے"

عباسی خلافت کے دور میں علم و فن اور فلسفہ و مذہب اگر کہیں پھلا پھولا تو وہ مسلمانوں کی حکمرانی کے اندر، باقی دُنیا میں ان چیزوں کا وجود نہ تھا۔ ایچ، جی ویلیس لکھتا ہے کہ: "سائنسی طریقوں کو اپنانے اور استعمال کرنے میں یونان کو اگر باپ کا درجہ حاصل تھا تو عربوں کو منھ بولا باپ کہنا چاہئے

جدید زمانے کو علم کی روشنی لاطینی ذریعے سے نہیں، عربوں کے توسل سے ملی ہے۔"
عربوں نے دوسرے کلچروں کو خاص کر ایرانی اور یونانی کلچروں کو اپنی چیز بنا لیا تھا۔ صدیوں سے خوابیدہ عرب دماغ کو اسلامی تعلیمات سے مہمیز ملی اور عرب بیدار و متجسس ہو کر دُنیا میں سب سے زیادہ تحقیقی دماغ ثابت ہوا۔ عرب ماہرین ریاضی نے ہم کو صفر اور الجبرا دیا، علم مثلث میں قابل قدر اضافے کئے، علم ہیئت کو نہایت بلند کر دیا اور زبردست طبیب اور سرجن پیدا کئے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد ان کا علم خواص الادویہ آج بھی ناقص نہیں کہا جا سکتا۔ عربوں نے چینیوں سے کاغذ بنانا سیکھ کر علم و ادب کی زبردست اشاعت کی اور یورپ کے لوگوں کو کاغذ بنانا سکھا کر موجودہ ترقی کی بنا ڈالی جس وقت یورپ کے لوگ جہالت کی تاریکی اور بدنظمی کے گڑھے میں پڑے تھے، عرب لوگ اس وقت ساری دُنیا کی ذہنی رہنمائی کا منصب ادا کر رہے تھے اور چار سو برس تک کرتے رہے۔
بغداد کو جاتے ہوئے ہوائی جہاز میں میرے ساتھ ایک عراقی ماہر تعلیم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ:-

"یورپ کا (نشاۃ الثانیہ) مسلمان عربوں نے شروع کیا۔ افلاطون، ارسطو اور اقلیدس ہم نے یورپ کو دئے۔ ہمیں نے ان کو ریاضی، طب، ہیئت اور دوسرے علم مکمل کر کے دئے اور یورپ کو ایک متمدن براعظم بنا دیا۔"

یہ عراقی بھی وہی کہہ رہا تھا جس کا یورپ کے تاریخ نویسوں نے اعتراف کیا ہے، البتہ اس کے بیان میں زور زیادہ تھا: بلاشبہ یورپ عرب کلچر کا مرہون منت ہے۔ میری اسلامی ملکوں کی سیاحت میں میں نے عراقیوں کو اس بات کو بار بار دہراتے سنا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ عرب شہنشاہی کے کارناموں کو دُہرا کر پُرانی عظمت و شان کو دوبارہ حاصل کرنے کے خواب دیکھ رہے ہوں۔ عراقیوں کو ایسے خوابوں کی صحیح اور حسب مراد تعبیر نکلنے کی مخالفت نہ تو علم الحیات کرتا ہے اور نہ تاریخی دلایل سے ہوتی ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہو گی کہ عرب دُنیا عہد نبوی کی طرح ایک بار پھر حرکت میں آجائے اور اسی طرح مستحکم بھی ہو جائے! عرب قوم نے جس اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں اور قوتوں کا ثبوت اُس زمانے میں دیا وہ صلاحیتیں اور قوتیں عرب دماغ میں آج بھی ہونی چاہئیں۔ آج عرب دنیا سوئی ہوئی ہے، اسے کسی محمدؐ کی ضرورت ہے جو اسے نیا الہام دیکر حرکت میں لے آئے!
اسلام نے ذہن انسانی کو کس قدر آگے بڑھایا اس کا اندازہ اصفہان اور قاہرہ میں مساجد و مقابر، باغات و محلات کے فن تعمیر سے ہو سکتا ہے۔
ہلاکو کے حملے نے بغداد کو تباہ کیا، ترکی حکومت نے قدیم نظام آبپاشی کو برباد ہو جانے دیا اور

عراق کی قدیم شان وعظمت آج زیرزمین مدفون ہے۔ امریکہ اور برطانیہ کے بعض علمی ادارے اس شان وعظمت کے نشان وعلامات زمین سے نکال کر اس کے کارنامے پیش کر رہے ہیں کہ عراق کیا کچھ رہ چکا ہے۔

۱۹۱۸ء میں برطانوی فوجوں نے عراق کو ترکوں کی حکمرانی سے آزاد کرایا لیگ آف نیشنز نے اس کی سیادت برٹش کے سپرد کردی، اس عرصے میں عراقیوں اور برطانیہ سے کئی سخت معرکے ہوئے اور ۱۹۳۲ء میں انھوں نے اپنے ملک کو آزاد و خود مختار بنالیا۔ عراقیوں کی جنگی اسپرٹ اس حکومت کی بالادستی کو بھی گوارا نہیں کرسکتی، جس نے اسے چار سو برس کی غلامی سے نجات دلائی۔ لیکن آزاد و خود مختار عراق کو ہنوز ایک قوم بننے کے درمیانی منزل سے گزرنا ہے۔ وسطی مشرق کی تمام مسلم قوموں میں عراق سب سے زیادہ بےچین ہے وہ انتہائی جدوجہد کررہا ہے کہ قدامت سے باہر نکل آئے وہ قدیم روایات اور جدید علوم کی کشاکش میں مبتلا ہے، اس کا ایک پاؤں پرانی دنیا میں ہے اور دوسرا نئی دنیا میں۔ پہلی کی علامت صحرائی بدوی ہے جو آج بھی زمانہ ابراہیم کی طرح خانہ بدوش ہے اور دوسری فصیح و تیز انگریزی بولنے والا طالب علم ہے۔ آج عراق نہ قدیم ہے نہ جدید۔ ذہنی اور جغرافیائی، دونوں اعتبار سے وہ ایک چوراہے پر کھڑا ہے۔

وسطی مشرق کی تمام قوموں میں عراقی سب سے زیادہ جذباتی اور بےچین ہو جانے والی قوم ہے اندرون ملک کے معاملات یا بیرونی حالات میں کوئی قوم اتنی سریع العمل نہیں ہے جتنی عراقی قوم ہے۔ پچھلے چھبیس برس میں عراق کی حکومت باون مرتبہ تبدیل ہوئی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں نازی طرفداری کا جتنا شدید اور کامیاب مظاہرہ ۱۹۴۱ء میں رشید الگیلانی نے کیا ویسا کسی ملک میں نہیں ہوا۔

حال میں ایک اور بغاوت ہوئی جو برطانیہ اور عراقی حکومت دونوں کے خلاف تھی۔ ۱۹۴۸ء میں وزیر اعظم صلاح جبر اور اس کی حکومت نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا۔ بغداد کے لوگوں نے اس معاہدے کی زبردست مخالفت کی۔ قتل وخون بھی ہوا۔ جبر کی حکومت گر بھی گئی مگر عوام کی بےچینی اور باغیانہ اسپرٹ ختم نہیں ہوئی۔ بظاہر سکون ہے مگر تہ میں بےچینی موجزن ہے۔ ملک کے اندرونی حالات اس تلخی میں اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ گرانی بے حد بڑھ گئی ہے اور حقیر درجے کی ضرورت زندگی کی فراہمی بھی مشکل ہے۔ بغداد کا ہوائی اڈا بہترین اڈوں میں سے ایک ہے جہاں جدید تمدن کا ہر سامان عشرت بہم ہے۔ اس پر عراقی فخر کرتا ہے لیکن اس سے اس کی تسکین نہیں ہوتی، عراقی مرد اور عورت، بوڑھا اور بچہ، روٹی اور کپڑے کے لئے پریشان ہے۔

عراق میں زمینداری نظام نہیں تھا۔ ترکوں کے پنجے سے آزاد ہوتے وقت اگر زمین کو سرکاری ملکیت قرار دیدیا جاتا تو عراقی عوام اس بدحالی میں نہ ہوتے۔ لیکن اس وقت قبیلوں کے شیخ نے قبائلی علاقے کی زمین پر اپنا حق ثابت کیا اور وہ مان بھی لیا گیا۔ اس وقت سے زمینداری کا پھیلاؤ بڑھ رہا ہے اور منجملہ دوسرے اسباب کے فلاحین کی فاقہ کشی کا ایک سبب زمینداری بھی ہے۔ جس طرح سیاسی ناپختگی عراقی حکومتوں کے جلد جلد گر جانے کی وجہ ہے اسی طرح زمینداری نظام فلاح کی اقتصادی بدحالی کا ذمہ دار ہے۔

صدیوں کے جمود تعطل کے باوجود احیائے ثانی کا جتنا روشن مستقبل عراق کا ہے اتنا کسی اسلامی ملک کا نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ عراق اس کام کے لئے دل و جان سے مستعد ہو جائے۔ مصر کے لئے ایک دریائے نیل غذا بہم پہونچاتا ہے، عراق کے پاس دو نیل ہیں، دجلہ و فرات، عراق میں نہ تو مصر کی طرح بارش کی کمی ہے اور نہ آبادی کا اتنا دباؤ ہے۔ عراق کی مردم شماری مصر کے مقابلہ میں ایک چوتھائی ہے اور قابل کاشت زمین مصر سے چوگنی ہے۔ اس کے علاوہ عراق کے پاس تیل کے چشمے بھی ہیں۔

عراق کی آب و ہوا گرم ہے لیکن میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہے کہ دن بھر کام کرنے کے بعد عراقی مزدور پژمردہ و مضمحل نہیں ہو جاتا۔ عراقی مزدور کو سست اور کاہل سمجھنا غلط ہے اس میں سستی اگر ہے تو ناکافی تغذیہ کا نتیجہ ہے۔ یا پھر دوسری بات یہ ہے کہ مشرق وسطیٰ کے مزدوروں کے سامنے کوئی وجہ تحریک نہیں ہے۔

زمانہ قدیم کی طرح عراق کی اہم پیداوار آج بھی غلّہ ہے۔ وہ تمباکو اور روئی کی کاشت بھی کرسکتا ہے۔ غلّہ کے علاوہ اس کے کھجور ہیں جو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ عراق میں کھجور کے درختوں کی گنتی تین کرور ہے۔ ۱۹۳۱ء میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار ٹن کھجور برآمد ہوئی تھی۔

ترکی حکمرانی کے مقابلے میں عراقی حکومت نے زراعت میں نمایاں ترقی کی ہے۔ آبپاشی چوگنی ہوگئی ہے کہیں کہیں کاشت میں مشینوں کا استعمال بھی ہونے لگا ہے۔

عراق کو یہ موقعہ حاصل تھا کہ زمینوں کو سرکاری بناکر دوسرے اسلامی ملکوں کے لئے زرعی قانون میں اصلاحات کا دروازہ کھول دیتا، مگر اس نے وہ زریں موقعہ کھو دیا اور آج زمیندار بالادست ہے۔ عراق میں کاشت بٹائی پر ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں کسان کو تیس فیصدی ورنہ چالیس فیصدی غلّہ ملتا ہے۔ اس میں سے اسے نہری ٹیکس وغیرہ بھی دینا پڑتا ہے، نقد کی صورت میں اس کے پاس شمالی علاقے میں چوبیس سے چالیس امریکن ڈالر اور جنوبی علاقے میں اسے ڈیوڑھا پہونچتا ہے۔

عراقی کسان کا افلاس جلی حروف میں لکھا ہے۔ اوسط اموات مصر کی طرح یہاں بھی زیادہ ہے۔ سنہ ۳۶ء ۲۷ فی ہزار تھی۔ بچوں کی موت کا اوسط بھی ڈراؤنا ہے سنہ ۴۱ء میں ۲۲۷ دو سو ستائیس فی ہزار تھا۔ ہر سال سات آٹھ لاکھ انسان ملیریا کا شکار ہوتے ہیں۔ عراق میں بھی وہی بیماریاں عام ہیں جو مصر میں ہیں۔ بغداد میں اندھوں کی گنتی ساڑھے سات ہزار ہے اور اوسط زندگی چھبیس سال ہے۔

افلاس اور بیماریوں کی اس شدت میں برطانیہ و امریکہ کی مدد بھی کیا کام دے سکتی ہے پینتالیس لاکھ کی مردم شماری میں پینتیس لاکھ فلاحین کی تعداد ہے۔ زمین سے نہ فلاح کی محبت ہے نہ زمیندار کو۔ زمیندار چاہے تو فلاح کو ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری زمین پر بھیج دیتا ہے اور فلاح بھی بہتر آراضی پا سکتا ہے تو پرانی کو چھوڑ دیتا ہے۔

عراق سے بہتر چراگاہیں دنیا میں کہیں نہیں ہیں مگر مویشی کا اوسط عراق میں بہت کم ہے۔

قوت پیداوار کے لحاظ سے عراق سب سے زیادہ دولت مند ملک ہو سکتا ہے مگر سب سے زیادہ مفلس ہے۔ یہ نوزائیدہ قوم شدید قسم کی سیاسی توم ہے مگر استحکام سے محروم ہے۔ عراق کا تعلیم یافتہ طبقہ آس پاس کے ملکوں میں لبنانیوں کے علاوہ سب سے زیادہ پختہ مغز ہے لیکن عراق کا زمیندار سب جگہ کے زمینداروں سے زیادہ ناسمجھ اور ضدی ہے۔

عراقی لوگ عرب بھی ہیں اور مسلم بھی مگر محمدؐ کے یہ الفاظ بھلا چکے ہیں کہ "میں نے تمھیں زمین دے کر برکت دی ہے! کھاؤ اور پیو اور ضایع مت کرو"!

---


# "نگار" کے مکمل فایل

از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۲۹ء مکمل فایل مجلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۳۰ء مکمل فایل مجلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۳۱ء مکمل فایل مجلد قیمت سات روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۳۲ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۳۵ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۳۶ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے

از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۳۷ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۴۶ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۴۷ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۴۸ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۴۹ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے
از جنوری لغایتہ دسمبر سنہ ۵۰ء مکمل فایل بلا جلد قیمت چھ روپے

محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ پتہ:- س۔ ذ۔ معرفت نگار۔ لکھنؤ

# بارھواں باب

## (تل عفیف)

فلسطین کے ہوائی اڈے سے ایک امریکن ہواباز نے مجھے اپنی کار میں شہر پہونچایا۔ راستے میں اُس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں پہلی دفعہ تل عفیف آیا ہوں۔ میرے بتانے پر کہ یہ میری پہلی سیاحت تھی اُس نے کہا:-

"یہ شہر ایسا ہے جہاں امریکن اجنبیت محسوس نہیں کرتے بلکہ سمجھتے ہیں کہ وہ امریکہ ہی میں ہیں۔ اکثر امریکن چھٹیاں منانے یہیں آتے ہیں۔"

تل عفیف کی تعریفیں میں نے اکثر سنی تھیں، اور عفیف کا نظارہ میرے لئے حیرتناک نہ ہونا چاہئے تھا، لیکن جب میں شہر کے اندر داخل ہوا تو میری حیرت کی حد نہ تھی۔ دن ڈھل رہا تھا، ہماری موٹر آہستہ خرامی سے کشادہ بازاروں سے گزر رہی تھی، اور مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں جسمانی و روحانی دونوں اعتبار سے کسی معجزنما شہر میں پہونچا دیا گیا ہوں۔

شہر زندگی اور زندگی کے ہنگامہ سے معمور تھا۔ ہر سڑک پر موٹروں کی قطاریں دکھائی دیتی تھیں۔ پٹریاں پیدل چلنے والوں سے بھری تھیں، اور دوکانیں مال اسباب سے۔ دوکانوں کی رونق و نمایش دیکھنے کے قابل تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی حرکت زیادہ اور شہر چھوٹا ہے، جیسے کسی نوجوان کو اس کے بچپن کے کپڑے پہنا دئے جائیں۔

یہاں نہ تو کثیر دولت کی علامت تھی اور نہ شدید افلاس کی۔ نہ تعیش کے نشان تھے نہ احتیاج کے۔ مصر و ایران کی طرح یہ دو انتہائی صورتیں تل عفیف میں کہیں نظر نہ آتی تھیں۔ گداگروں کی قطاریں اور گلیوں میں بے والی وارث چھوکرے مفقود تھے۔ بار برداری کے اونٹوں اور گدھوں کے قافلے نظر نہ آتے تھے کیونکہ مال واسباب کی ڈھلائی موٹر ٹرک سے ہوتی ہے، انجن نے انسانی مشقت کو ہلکا کر دیا ہے

ہوا کے ساتھ گرد کا اُڑنا البتہ ثابت کرتا تھا کہ صحرا قریب ہے، یا پھر لاؤڈ اسپیکر عبرانی زبان کی وجہ سے بتاتا تھا کہ یہ امریکہ نہیں ہے۔

مجھے اسلامی ملکوں میں سفر کرتے چھ مہینے ہو چکے تھے اور ہر موقعہ پر یوروپین ڈاکٹروں سے یہی سُنا تھا کہ کھانے پینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ایک مرتبہ بس میں سفر کرتے ہوئے ایرانی ساتھیوں کے ساتھ میں نے بھی تازہ و خوشرنگ انگور خرید کر کھائے تھے اور اس کے جرمانے میں معدے کی شکایت میں بتلا رہ چکا تھا، لیکن تل عفیف پہونچ کر میں نے نل کا پانی نہایت آزادی کے ساتھ پیا اور ہوٹل کی خادمہ سے سوال کرنے کی ضرورت نہ ہوئی کہ پانی اُبال لیا گیا ہے یا نہیں۔ اس قسم کی احتیاط کرنا میرے اوپر لازم ہو گیا تھا، لیکن یہاں کے بازار میں تازہ پھل اتنے اچھے معلوم ہوئے کہ میں نے ایک تھیلا بھر خریدے اور ان کو کھاتے ہوئے مجھے یہ احساس ہوا کہ میں قضا سے پنجہ لڑا رہا ہوں۔

بازار بقعۂ نور بنے ہوئے تھے۔ عمارتیں یک منزلہ ہیں اور بالعموم سفید۔ اونچی عمارت بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ قاہرہ کی طرح یہاں بھی کیفے اور ریسٹوراں بکثرت ہیں۔ چائے اعلیٰ قسم کی ہر جگہ پینے کو ملتی ہے۔ قہوہ، امریکن مذاق نہیں بلکہ یوروپین ڈھنگ پر طیار کی جاتی ہے۔ بیرے خدمت گار مہذب اور مستعد ہیں۔

تل عفیف اگرچہ ریگزار پر آباد ہے مگر وہاں برگزار کی کثرت ہے۔ چار میل لانبے ساحل کے ساتھ ساتھ خوشنما پارک ہیں جن میں خوبصورت صحرائی سرو اور دوسرے درختوں کی قطاریں دل کو لبھاتی ہیں تل عفیف آباد کرکے یہودی قوم نے فطرت کے ساتھ اپنی محبت کا ثبوت دیدیا ہے، باغ و راغ کی کثرت سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ریگستان سے جنگ کرنے میں یہودیوں نے پوری طرح معلوم کر لیا ہے کہ وہاں کس قسم کے درخت نشو و نما پا سکتے ہیں۔ یہ شہر جدید تعمیر ہے مگر اس میں عمارتی شان و عظمت کا نہیں بلکہ نفاست و آرام کا زیادہ خیال رکھا گیا ہے۔ صرف ایک کالج کی عمارت ہے جس پر گنبد نظر آتا ہے ورنہ سب جدید وضع کی عمارتیں ہیں۔ یہ بات صاف محسوس ہوتی ہے کہ شہر کی تعمیر میں عہد انجیل کا کوئی خیال درمیان نہیں آیا۔ اور مصر و ایران کے برخلاف اس شہر کی کوئی چیز قدامت کی یاد نہیں دلاتی سڑکوں اور بازاروں کے نام البتہ انجیل سے لئے گئے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ان لوگوں کے نام پر بھی بازار آباد کئے گئے ہیں جنھوں نے صیہونی تحریک سے ہمدردی کی ہے۔

پوری دُنیا میں تل عفیف ہی خالصًا یہودی شہر ہے، جسے یہودی ہاتھوں نے بنایا اور جس میں یہودی ہی آباد ہیں، یہاں یہودیوں کی حکمرانی ہے اور جس کی دولت و ثروت یہودیوں ہی کے باعث ہے

جہاں عبرانی سرکاری زبان ہے۔ (البتہ انگریزی زبان کو ثانوی زبان کا درجہ حاصل ہے اور بوڑھے بچے ٹیکسی ڈرائیور اور پولیس میں بھی انگریزی بول سکتے ہیں) سڑکوں کے نام کی تختیاں عبرانی اور انگریزی دونوں زبانوں میں ہیں۔ اسکولوں میں عربی بھی لازمی مضمون ہے۔

فلسطینی یہود کی نئی نسل جو نفرت کی آب و ہوا میں پیدا ہوئی اور مجادلے کے ماحول میں پروان چڑھی نہایت مضبوط و جفاکش ہے اور جتنی جفاکش ہے اتنی ہی خوش و خرم بھی ہے۔ یہودی نوجوان جس انہماک سے کتابوں پر جھکے دکھائی دیں گے، اسی ولولے سے ہل بھی چلاتے نظر آئیں گے۔ اس نسل کے دل میں داخلی یا خارجی قسم کا کوئی خطرہ جگہ نہیں پا سکا ہے۔ وہ بڑی بے خوف نسل ہے، اور اپنے ماضی یا مستقبل کو جذبات کی عینک سے دیکھنا نہیں جانتی۔ وہ تحقیر و تذلیل کو برداشت کرنا نہیں جانتی، کیونکہ اس نئی نسل میں خود اعتمادی اتنی ہی وسیع ہے جتنا تل عفیف کا آسمان وسیع ہے۔ ایک انیس سال کے لڑکے کے الفاظ ہیں:

"آنسو بہانا ہم بھول چکے اور رحم کی التجا کرنا چھوڑ چکے ہیں! ہمارے باپ دادا کے طریقے اب ہمارے کام کے نہیں، ہم یا تو جئیں گے یا مر جائیں گے!"

یہ لڑکا جس وقت یہ بات کہہ رہا تھا تو اس میں جوش و جذبہ مطلق نہ تھا بلکہ نہایت سکون و سنجیدگی کے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ جو خیال و احساس لڑکوں میں ہیں وہی لڑکیوں میں بھی پائے جاتے ہیں، لڑکیاں نیکر پہنتی، بال ترشواتی اور غازہ لگاتی ہیں۔ مگر ان میں مصر و ایران کی جدید لڑکیوں کی سی نزاکت نمایاں نہیں ہیں بلکہ وہ بیسویں صدی کی بچیاں ہونے کے اعتبار سے اس نظریہ کی قایل نہیں کہ مرد ان سے زیادہ مضبوط اور زیادہ اہل ہوتے ہیں۔ وہ آنسو بہانے اور ٹھنڈی سانسیں بھرنے کو نسائیت کا زیور نہیں سمجھتی ہیں۔ ہوٹل میں میری ملاقات ایک یہودی لڑکی سے ہوگئی، میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا وہ لڑکیوں کا دہشت انگیز جماعت میں شامل ہونا پسند کرتی ہے۔ تو اس نے جواب دیا کہ:-

"میں ہر اس بات کو پسند کر سکتی ہوں جو ہمیں ہمارے وطن کو آزاد رکھنے کے لئے ضروری ہو۔"

۱۹۰۹ء میں جافہ کے ساٹھ یہودیوں کی جماعت نے، جافہ کے مضافات میں تل عفیف کی بنیاد ڈالی تھی اُسوقت تل عفیف کا وجود ایک واہمہ و خیال کا درجہ رکھتا تھا اور آج کا شہر ایک ٹھوس حقیقت ہے مشینوں کی مدد کے بغیر صرف ہاتھوں کے اوزاروں سے کام لیکر جافہ کی ایک نئی مضافاتی آبادی قایم کرنا اس جماعت کا مقصود تھا۔ ریگزار سے مقابلہ کرنا یقیناً حوصلے پست کر دینے والا تھا، لیکن اس چھوٹی سی جماعت کا جوش اور جذبہ کسی وقت کمزور نہیں پڑا۔ ابتدا میں صرف تین سو آدمی وہاں آباد ہوئے تھے۔ اچانک پہلی جنگ عظیم شروع ہوگئی اور ترک حکمرانوں نے ان یہودیوں کو وہاں سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا۔ لیکن

۱۹۱۸ء میں جب اتحادیوں کی فتح ہوئی تو وہ یہودی پھر وہاں جاکر آباد ہو گئے اور آبادی اٹھارہ سو ہو گئی، پھر دُنیا کے مختلف حصوں میں ایسے اسباب پیدا ہوئے کہ یہودی ترک وطن کر کر کے تل عقیف میں آباد ہوتے رہے، ۱۹۲۵ء میں بارہ ہزار، ۱۹۴۸ء میں ایک لاکھ بیس ہزار اور آج دو لاکھ کی آبادی ہے۔ شہر کی تعمیر جاری ہے، تل عقیف کے "ٹاؤن کلارک" مسٹر ندیوی نے مجھے بتایا کہ "ان کا مقصد یہ ہے کہ ہر کنبے کے پاس اپنا ذاتی مکان ہو"۔

فلسطین کو وطن بنانے والوں میں بہت سے قابل اور ماہرین فن بھی شامل تھے جنھوں نے شہر کی تعمیر میں حصّہ لیا۔ آج کچھ بوڑھی عورتوں کے علاوہ وہاں کوئی بے پڑھا لکھا نہیں ہے۔ ۱۹۴۷ء کے ایک کروڑ ڈالر کے بجٹ میں سے سٹی کونسل نے تیس لاکھ ڈالر صرف تعلیم پر خرچ کئے تھے۔ بچوں کی تربیت اور تعلیم پر بہت زیادہ توجہ دیجاتی ہے۔ اسپورٹس کی بڑی قدر ہے۔ نشر و اشاعت بڑے پیمانے پر ہوتی ہے، دو لاکھ کے شہر میں بارہ روزانہ اخبار نکلتے ہیں۔ دس عبرانی زبان میں اور دو جرمن زبان میں، کیونکہ جرمنی سے آئے ہوئے یہودی عبرانی زبان کے ماہر نہیں ہو سکے ہیں۔ اس وقت بہت زیادہ کام دوسری زبانوں کے کلاسکس کو عبرانی میں منتقل کرنے پر ہو رہا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں کتب فروشوں کی دوکانوں کی کثرت ہے اور پانچ لاکھ ڈالر کی کتابیں دوسرے ملکوں سے درآمد کی جاتی ہیں۔ اسی طرح تین لاکھ ڈالر سالانہ کے اخبار رسالے دوسرے ملکوں سے آتے ہیں۔ شہر میں پانچ بڑی لائبریریاں ہیں۔ اصفہان میں میں نے دو لائبریریاں دیکھیں جہاں کتابوں کی تعداد سیکڑوں تک محدود ہے۔ تل عقیف میں موسیقی کو بھی بہت اونچا درجہ دیا گیا ہے۔ تھیٹر روز افزوں ترقی پر ہے اور دُنیا کے بہترین ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔

تل عقیف میں ایک کلچری ادارہ ایسا ہے جس کی مثال دنیا میں کہیں نہیں ہے وہاں کی پریس ایسوسی ایشن ہر پندرھویں دن ایک ادبی اجتماع کرتی ہے جس میں اڈیٹر، اخبار نویس، ادیب و شاعر جمع ہوتے اور اپنا تازہ کلام پیش کرتے ہیں۔ اس شہر میں اظہار خیال کی کامل آزادی ہے اور یہاں کا ادب کسی سیاسی نظریئے کے سانچے میں ڈھل کر نہیں نکلتا، حالانکہ تل عقیف کلچری اعتبار سے اس وقت کڑھاؤ میں اُبل رہا ہے۔

یہاں سنہرے بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکیاں (بلونڈز) اس کثرت سے ہیں جتنی آپ زیورچ یا پراگ میں دیکھیں گے۔ میں نے جب اس حقیقت پر حسرت ظاہر کی تو ایک ممتاز اہل قلم نے کہا کہ:-

"شاید خدا کی مرضی یہی ہے!"

جافہ کے عرب باشندے بھی سامی النسل ہیں مگر ان میں اور فلسطین کے یہودیوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ زبان اور عادات و اطوار سے قطع نظر جسمانی ساخت میں بھی فرق ہے اور ذہنی انداز بھی مختلف

ہے۔ تل عفیف کے یہودی خود بھی پچاس مختلف قوموں کا مجموعہ ہیں۔ عجیب بات ہے کہ وہ بچے بھی جو فلسطین میں پیدا ہوئے ہیں، سامی نسل کے نہیں معلوم ہوتے۔ ان میں یہودیت کی کوئی علامت نظر نہیں آتی اس پہلو سے بھی فلسطین ایک اونٹنا ہوا کڑھاؤ ہے۔

تل عفیف کے لوگ بالعموم یوربین وضع کا لباس پہنتے ہیں جو یورپین کم اور امریکن زیادہ ہے۔ میں نے لوگوں کو اتنا خوش پوش دیکھا تو سوال کیا کہ کیا یہاں کوئی شخص غریب نہیں ہے۔ تو میرے ایک دوست نے جواب دیا:-

"بلاشبہ یہاں غریب بھی ہیں۔ لیکن سب متمدن ہیں"

الغرض تل عفیف اتنا مصروف و منہمک شہر ہے اور وہاں اس قدر حرکت و عمل ہے کہ دو لاکھ کی آبادی پانچ لاکھ کی معلوم ہوتی ہے۔ کوئی شخص نکما اور بیکار نہیں، تجارت و صنعت، طباعت و اشاعت ادب و علم، موسیقی و رقص، سبھی پر کام ہو رہا ہے اور بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ پورے مشرق وسطیٰ میں تل عفیف ہی ایسا شہر ہے جہاں چودہ سال سے کم عمر بچے سے کام لینا جرم ہے اور یہ قانون نافذ العمل بھی ہے۔ تل عفیف اب ہیرا تراشی کا خاص مرکز بن گیا ہے۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں اس کی ہیرے کی برآمد سوا دو کرور ڈالر کے قریب تھی۔ اس شہر میں شان و شوکت کی نمایش کا سراغ نہیں ملتا اور محنت و مشقت کے علامات ہر جگہ نمایاں ہیں۔

دوران گفتگو میں ایک جرمن یہودی نے مجھ سے کہا:-

"ہم نے اگر ریگستان پر فتح پاکر اسے باغوں سے ڈھک دیا ہے تو ایک دن ہم عربوں سے معاملہ کرنے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے"

ان الفاظ میں سمجھنے کے لئے بہت کچھ ہے۔

---


# نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ۔ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اس لئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔

قیمت چار روپیہ (للعہ) علاوہ محصول۔ مینجر نگار لکھنؤ

# تیرھواں باب

## (ایک نیا سماج)

جس روز میں نے فلسطین کی سرزمین پر قدم رکھا اُس کے دوسرے ہی دن سے سخت قسم کی بارش شروع ہوگئی۔ چونکہ فلسطین پہونچ کر (قاہرہ و طہران کی جمودی حالت دیکھنے کے بعد) مجھے حرکت و عمل کے دیکھنے کا پہلا موقع ملا تھا، اس لئے مجھے فلسطینی دیہات سے بڑی توقع ہوگئی تھی۔ بارش کی کثرت یقیناً میری دیہاتی سیاحت میں حارج ہوتی اگر فلسطین کی بہترین سڑکیں میری مدد نہ کرتیں۔

پہلے میں اس گاؤں میں پہونچا جس کا نام غوات برنیر ہے۔ اس کے متعلق مجھ سے بڑی تعریفیں کی گئی تھیں اور بتایا گیا تھا کہ یہ محض مثالی اور نمونے کا گاؤں نہیں ہے جیسا عام طور سے تقریباً ہر ملک میں ہورہا ہے بلکہ پورے فلسطین میں سب سے زیادہ سائنسی طریق پر منظم اور پوری دُنیا میں ایک نئے سماج کی حیرتناک لیبارٹری (معمل) بھی ہے۔ گاؤں کی پوری آبادی جمہوری اصولِ خود مختاری پر امداد باہمی کے طریقوں پر کاشت کرتی اور زندگی گزارتی ہے۔ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے، نہیں کہا جا سکتا مگر بحالت موجودہ اس میں شک نہیں یہودیوں نے نہ صرف طریق کاشتکاری بلکہ طرز زندگی کو بدل کر معجزہ پیش کیا ہے۔

اپنی سیاحت میں میں نے زراعت کے ترقی پسند طریقوں کا خاص طور پر معائنہ کیا ہے، اور کناڈا میں رہ کر وہ گاؤں میں نے دیکھے ہیں جہاں DUKHBOR جماعت کے لوگ زار روس کے جبر و تشدد سے بھاگ کر آباد ہوئے تھے اور مذہبی عقیدے کی طرح نجی ملکیت کے خیال کو تیاگ کر مشترک زراعت پر منظم ہوگئے تھے۔ ان لوگوں کی جفاکشی نے ان کو اپنے مقصد میں کامل طور پر کامیاب کیا، مگر چونکہ جدید تعلیم اور کلچری ترقی سے متنفر رہے اس لئے یہ جماعت اپنے لیڈر کی محکوم بن کر رہ گئی۔ جن دنوں میں وہاں گیا تھا، انکا لیڈر پیٹر ویری گین تھا جو کسی طرح روسی زار سے کم نہ تھا۔ بجز اپنے لیڈر کی حکمرانی کے یہ جماعت کسی

اور کے تحکم سے واقف بھی نہ تھی۔ اس کی ہر خواہش کو پورا کرنا ان کا فرض ہے۔ پیٹر جب سفر کرتا ہے تو دو نوجوان لڑکیاں اس کے ساتھ رہتی ہیں۔ بلا شبہ ان لوگوں نے مشترک کاشت میں نمایاں کامیابی حاصل کی ہو مگر ان کے لیڈر نے ان کو جو سماجی درجہ دیا ہے، اگر ٹالسٹائی اس کو دیکھتا یا تصور میں لاسکتا تو رو پڑتا۔ یہ روسی کاشتکار ٹالسٹائی کے مدد سے روس سے نکل کر کناڈا میں آباد ہوئے تھے۔

اسی طرح میں نے روس میں مشترکہ کھیتی کا قانون جاری ہونے سے پہلے شمالی قفقاز کی دو آبادیاں دیکھی تھیں جہاں مشترک زراعت قایم ہوچکی تھی۔ ایک آبادی روسیوں کی تھی دوسری فینوں کی اور یہ سب امریکہ میں اچھی کاشتکاری کر کے خوشحالی سے بسر کرتے تھے۔ مگر جب روس میں انقلاب کامیاب ہو لیا تو یہ لوگ اپنا سامان اور زمینیں فروخت کر کے روس چلے آئے اور مشترک سرمائے سے مشترک زراعت کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ کیونکہ امریکہ سے بہترین قسم کے آلات زراعت ساتھ لائے تھے اور امریکن کاشت کے جدید طریقوں سے واقف تھے۔ ان دونوں بستیوں نے اتنی کامیابی حاصل کی کہ نمونہ و نمایش کی چیز بن گئیں ان کا کلچری اور زندگی معیار آس پاس کے دیہات سے بلا شبہ بہت اونچا تھا۔ لیکن جب روس میں مشترکہ کھیتی کی اسکیم پر عمل درآمد ہوا تو یہ دونوں بستیاں بھی اس میں مدغم کردی گئیں۔

چونکہ یہ مثالیں میرے تجربے میں آچکی تھیں اسلئے فلسطین کے اس گاؤں کو دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا تھا مشترک کاشت و زراعت کے تجربے اکثر کئے گئے، کہیں ناکام رہے اور کہیں تھوڑی بہت کامیابی ہوئی یا ایک پہلو سے پوری کامیابی ہوئی اور دوسرے پہلو سے تشنہ رہے۔ لیکن فلسطین میں یہ تجربہ بہمہ وجوہ کامیاب ہے۔ یہ مشترک کاشت و مشترک سماج کسی سیاسی نظریے بوجھل نہیں ہے اور اس کو کامیاب بنانے والے یہودی نو آباد کاروں نے اپنے لئے ایک موزوں مقام حاصل کرلیا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں فلسطین میں ایسی نو آبادیوں کی تعداد ایک سو چھیاسٹھ تھیں اور اب برابر بڑھتی جارہی ہیں۔

یہودی دماغ نے اس اشتراک عمل اور امداد باہمی کا جو کارنامہ پیش کیا ہے اس کی اہمیت کا پورا اندازہ کرنے کے لئے یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہاں ابھی تک اس قسم کی تنظیم کے لئے کوئی قانون جاری نہیں ہے۔ زیادہ زرخیز اور نفع بخش علاقے اس وقت بھی نجی ملکیت ہیں جن میں حکومت یا سماج کسی طرح مخل نہیں ہوسکتی۔

اس صدی کے اوایل میں جب یہودیوں نے زمینیں خریدنا شروع کیں تو ان کے وہی تیور تھے جو عرب زمینداروں کے ہیں۔ یہودی زمیندار بھی ایک نیا آفندی بن گیا تھا۔ چنانچہ یہودی زمیندار اور یہودی مزدوروں میں مزدوری کی کشا کش ضروری ہوگئی، اور بالآخر مزدور اس نتیجے پر پہونچے کہ اس بلائے

نجات صرف امداد باہمی کے اصول پر عمل کرنے سے مل سکتی ہے، اس خیال و تصور کو تعلیم یافتہ طبقے کی ہمدردی سے بھی تقویت پہونچی، جس میں صیہونی تحریک کے لیڈر بھی شامل تھے۔ جوزف بنیسیل نے جو دغانیہ نوآبادی کے ڈائریکٹروں میں سے ایک ہے، لکھا تھا کہ :۔

"کاروبار زراعت میں ہم امن کے خواہشمند ہیں، ہم نے کھیتوں میں مزدوری کی ہے اور اس تجربے نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں"

فلسطین میں امداد باہمی کے اصول پر آباد ہونے والے لوگوں کو "یہودی قومی فنڈ" سے زمین خرید کر بلاقیمت دیدی جاتی ہے۔ البتہ دو فیصدی سالانہ بطور لگان کے وصول کیا جاتا ہے شرط صرف یہ ہوتی ہے کہ زمین لینے والے مزدور کے ذریعہ سے نہیں بلکہ خود کاشت کریں گے۔ اس شرط کی خلاف ورزی کرنے پر زمین سے بیدخل کئے جاسکتے ہیں ورنہ اُنچاس برس کا پٹہ ہی عملاً دائمی پٹہ ہوتا ہے اور وہ زمین کاشتکار کی اولاد میں وراثتاً بغیر رجسٹری کے منتقل ہوتی رہتی ہے۔ فصل خراب ہوجانے کی صورت میں لگان کی رقم بتدریج وصول کی جاتی یا معاف ہوجاتی ہے۔ ان شرائط کی وجہ سے کسان اپنی زمینوں کو بہترین حالت میں رکھنے کی متواتر کوشش کرتے ہیں۔ اور کاشتکار کے یہ حقوق صرف یہودیوں کے لئے نہیں بلکہ عربوں کے لئے بھی ہیں۔

اس حقیقت کا اندازہ کرلیا گیا ہے کہ اصول اشتراک پر کاشت کرنا اور سوشلزم کے اصول پر دیہاتی نظام بنانا مخصوص طبع مزاج کے لوگوں کے لئے ہی مناسب ہوسکتا ہے، سب کے لئے نہیں۔ اس لئے ایسے گاؤں الگ آباد کئے گئے ہیں جن کو چھوٹے کاشتکاروں کی آبادیاں کہا جاتا ہے۔ اس تنظیم میں ایک کنبہ کو اکائی بنایا گیا ہے اور اس لئے کہ چھوٹے بیوپاری کا مال نسبتاً کم قیمت پاتا ہے، ایسے ہر گاؤں کی ایک کوآپریٹو بھی بنا دی گئی ہے، اور بڑی مشینیں جنھیں ایک کاشتکار نہیں خرید سکتا، مشترک سرمائے سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ کوآپریٹو گاؤں کی ضرورت کی ساری چیزیں اکٹھا خرید کرتی اور اسکی ساری پیداوار اکٹھا کرکے فروخت کرتی ہے کوئی بیمار پڑتا ہے تو پڑوسی اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اس کی کاشت پر جاکر کام کریں۔ گاؤں کے اجتماعی کام گاؤں پنچایت طے کرتی ہے۔ ۱۹۴۷ء تک ایسے تراسی گاؤں آباد ہوچکے تھے۔

جن لوگوں کی انفرادیت پسندی کو اتنا بھی گوارا نہیں، ان کے لئے ایک اور اسکیم جاری کی گئی ہے جسے درمیانہ کاشتکاری گاؤں نام دیا گیا ہے۔ ایسی آبادیوں کے لوگ جتنا ان کی پونجی ساتھ دیتی ہے، زمینیں خرید لیتے اور اس پر خود کاشت کرتے ہیں اور مزدور بھی لگا سکتے ہیں۔ ۱۹۴۵ء تک ایسی

نو آبادیوں کی تعداد پینتیس تھی۔

ان نو آبادیوں میں یورپ سے آئے ہوئے وہ یہودی زیادہ کامیاب ثابت ہوئے جو تعلیم یافتہ ہیں یا شہروں سے آئے ہیں۔ یورپی دیہات کا آدمی اتنا زیادہ کامیاب نہیں ہے۔

غرض، جب ہم موٹر سے غواط برنیر جا رہے تھے تو راستے میں بہت سے گاؤں پڑے اور پھر پہاڑی کے ڈھلان پر چڑھ کر ہم غواط برنیر پہونچے۔ اس گاؤں میں بارہ سو پچاس آدمیوں کی آبادی ہے۔ چھ سو پچاس بچے ہیں اور چھ سو مرد عورت ہیں۔ ہر چند یہ سب یہودی ہیں مگر مختلف آب و ہوا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں اکثر اعلیٰ تعلیم پائے ہوئے ہیں، جنھیں کاشتکاری کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اور ایسے بھی تھے جو اپنے آپ کو یہودی بھی نہیں سمجھتے۔ اٹلی کے یہودی اپنے تئیں یہودی مذہب کے اطالوی کہتے اور سمجھتے تھے، ایسے ہی عیسائی اپنے تئیں اطالوی کیتھولک سمجھتے تھے۔ قومیت سب سے بالا تر تھی لیکن جب مسولینی پر ہٹلر کا سایہ پڑا تو ان یہودیوں کو بھی سامی دشمنی کا تجربہ ہوا۔ اور یہ لوگ وطن میں غریب الوطن بن گئے، وطن بہر حال تلاش کرنا تھا اور وہ انھوں نے فلسطین کو بنایا، اور غواط برنیر میں بس گئے۔

یہ گاؤں ۱۹۴۳ء میں آباد کیا گیا۔ پہلی جماعت جب اس مقام پر پہونچی تو کوئی گاؤں یا مکان نہ تھا صرف زمین تھی۔ ڈیروں میں سکونت اختیار کر کے یہ لوگ کام میں جٹ گئے۔ شروع میں صرف پچیس ایکڑ زمین جوتی گئی۔ جب آبادی بڑھی تو زمین بھی اور مل گئی۔ اب یہ چھ سو کاشتکار پونے نو سو ایکڑ زمین پر کاشت کرتے ہیں۔

ایک ایک مکان کے اندر جا کر اور کھیتوں پر پہونچ کر ان کی سلیقہ شعاری دیکھی تو حیران رہ گیا کسی جگہ جنگلی جڑی بوٹی بھی تو نظر نہیں آئی۔ البتہ حال کی بارش سے کچھ کلّے پھوٹ آئے تھے۔ پینتالیس ایکڑ زمین پر باغ ہی باغ ہیں، جہاں سیب، نارنگی، انگور، لیمو اور دوسرے پھل اتنے ہی اچھے ہوتے ہیں جتنے کیلیفورنیا کے۔ بعض چیزوں کی تو چار چار فصلیں اترتی ہیں۔

پورے رقبے میں ڈھائی سو ایکڑ نہری زمین ہے باقی بارانی۔ بارانی زمین پر غلّہ بویا جاتا ہے۔ ہر چند یہ زمین غلّہ پیدا کرنے کے لئے مناسب نہیں اور اوسط پیداوار بہت کم ہے لیکن فلسطین کے لوگوں کو کھانے کے لئے غلّہ بھی تو چاہئے، نہری زمین گاؤں کی آبادی کے لئے بے حد فیض رساں ہے۔ بچھتر ایکڑ زمین پر چارہ کی غرض سے مکئی اور سورج مکھی کی کاشت کی جاتی ہے جس کے بیج سے کھانے کا تیل بھی نکل آتا ہے۔ مزید تیس ایکڑ ترکاریوں کے لئے وقف ہے اور تین فصلیں اترتی ہیں جو غواط اور تل عفیف میں صرف ہوتی

ہیں۔ ساتھ ہی پھولوں کی کاشت بھی ہوتی ہے جو بہت نفع بخش ہے۔ باغات کے علاوہ ایک بڑا رقبہ تاکستان کا ہے۔

کاشت کرنے کے طریقے اتنے عمدہ ہیں کہ مجھے گاؤں سکریٹری سے پوچھنا پڑا کہ یہ لوگ اتنے ماہر کاشتکار کیسے بن گئے۔ اس نے زرا سوچ کر جواب دیا کہ:-

"ہم اس پر مجبور تھے! اور چونکہ سب تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے سیکھ بھی جلدی لیا!"

سب سے زیادہ حیرت مجھے گاؤں کی ڈیری دیکھ کر ہوئی۔ مصر و ایران میں دو ایک جگہ کے علاوہ مجھے دودھ دینے والے اچھے جانوروں کے دیکھنے کی آرزو ہی رہی۔ غواط کی ڈیری جدید مشینوں سے آراستہ اور سفید ٹائل کی بنی ہوئی تھی، جس میں کہیں ایک دھبہ بھی نہ تھا۔ ڈیڑھ سو سے اوپر مویشی تھے۔ میں نے انھیں ہولسٹائن نسل کے سمجھا مگر سکریٹری نے بتایا کہ وہ سب فلسطینی نسل کے ہیں۔ دودھ کا سالانہ اوسط فی گائے ننانوے ہزار پونڈ تھا۔ دودھ بھی مشین سے دوہا جاتا ہے۔ اتنی چھوٹی سی آبادی نے ایک برف خانہ بھی کھول رکھا ہے۔ حفظان صحت کے اصول اور ریفریجریٹر مسلم ملکوں میں اہم مسئلے سمجھے جاتے ہیں مگر غواط میں بالکل معمولی باتیں ہیں۔ مختلف مشینوں کی مرمت کے لئے گاؤں کا لوہار ناقص تھا اور تل عفیف سے مستری بلانا طول امل تھا اس لئے اس آبادی نے ایک ورکشاپ بھی قایم کر لیا ہے جو صرف مرمت اور پرزے ہی بنانے کا کام نہیں کرتی بلکہ پوری مشین بنا لیتی ہے۔ گھریلو دستکاریوں کو وسعت دینے میں اس ورکشاپ کا بڑا ہات ہے۔ وہاں لوہے کی ڈھلائی کا کارخانہ بھی چل رہا ہے ایک فیکٹری فرنیچر اور دوسرے لکڑی کے کام کے لئے جاری ہے اور ایک اور حشرات الارض مارنے والی دوائیں طیار کرتی ہے۔ مشین ہی سے کپڑے دھلتے، روٹی پکتی، کپڑے سلتے اور جوتوں کی مرمت ہوتی ہے۔ عمارتیں بنانے والا ادارہ الگ قایم ہے اور پہاڑی کی چوٹی پر ایک ویجیٹیرین ہوٹل اور گاؤں والوں کی راحت گاہ ہے جہاں ایکسو بیس آدمی ٹھہر سکتے ہیں۔ پھلوں کو محفوظ کرنے کی ایک اور فیکٹری چل رہی ہے اور اس کا مال بیشتر انگلستان کو جاتا ہے۔ میں نے سکریٹری سے ایک مشین کے بارے میں پوچھا کہ کس کام کی ہے تو اس نے بتایا کہ:

"ایسینشیل آئل نکالتی ہے اور ہم نے خود ہی بنائی ہے، اب اس کی بہت مانگ ہے"

مزدوروں کا بیکار وقت گھریلو دستکاریوں میں صرف ہوتا ہے اور کوئی شخص کسی وقت بیکار نہیں بیٹھتا۔ میں نے سکریٹری سے پوچھا کہ گزشتہ سال پورے گاؤں کی کل آمدنی کیا تھی تو اس نے بتایا:-

"سنہ میں ہماری کل آمدنی چار لاکھ پونڈ تھی۔ اس میں ایک لاکھ کاشت کا منافع تھا

اور تین لاکھ گھریلو انڈسٹری کا۔"

یعنی کام کرنے والے ہر آدمی نے دو ہزار چھ سو امریکن ڈالر کمائے۔ مشرقِ وسطیٰ میں یہ اوسط آمدنی بہت بڑی دولت ہے۔ میں نے پھر سوال کیا کہ ہر آدمی کو نقد کتنا ملتا ہے تو اس نے کہا کچھ نہیں یا برائے نام۔

میں نے پوچھا: "فرض کرو وہ کوئی کتاب ہی خریدنا چاہتا ہے؟"

اسنے جواب دیا کہ: "کتاب کے لئے وہ لائبریرین کو اطلاع دیدیگا اور کتاب آجائے گی۔"

میں نے پوچھا: "اچھا اگر کوئی نوجوان چاہتا ہے کہ اپنی کسی دوست لڑکی کو تفریح کرانے لے جائے؟"

جواب ملا کہ: "اس صورت میں وہ خزانچی کے پاس جائے گا اور اسے مناسب رقم ملجائے گی لیکن وہ اگر اپنی بہن کو تفریح کراتا چاہتا ہے تو رقم کم ہوجائے گی۔"

یہودی قوم کی اس کو اپریٹو کاشتکاری کی کامیابی پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، لیکن آج تو زراعتی اور سماجک طریقے برتنے میں یہ کامیابیاں اپنا ثانی کہیں نہیں رکھتیں۔

جن لوگوں نے یہ سماجی انقلاب کر دکھایا ہے وہ بلاشبہ ٹالسٹائی، روسو اور کروپٹکین کے فلسفے سے متاثر تھے لیکن ان کی مشقت وجانکاہی در اصل حالات کے تقاضے کا نتیجہ تھی۔ ان کے سامنے کوئی نمونہ نہ تھا۔ فلسطین کی پہلی مشترک کھیتی اور سوشلسٹ سماج ۱۹۰۹ء میں دغانیہ بستی آباد کرنے سے شروع ہوئی تھی۔

مجھے یقین ہے کہ غوآطا میں اگر انفرادی کاشت کا طریقہ جاری ہوتا تو موجودہ صورت کا غولط کبھی وجود میں نہ آتا۔

اس بستی میں ہر میاں بیوی کے لئے ایک کشادہ اور آرام دہ کمرے کا مکان ہے۔ باورچی خانہ نہیں ہے کیونکہ سارے گاؤں کا کھانا ایک جگہ پکتا اور ایک جگہ کھایا جاتا ہے۔ بچے، بچوں کے گاؤں میں رہتے ہیں۔ شام کو جب والدین اپنے اپنے کاموں سے فرصت پاتے ہیں تو بچے گھر آکر ان سے ملجاتے ہیں۔ چھٹی کا دن بھی بچے والدین کے ساتھ گزارتے ہیں۔ ماں باپ اگر سیر تفریح کے لئے تل ابیب جائیں تو بچوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ سال میں ماں باپ کو دو ہفتے کی چھٹی ملتی ہے، بچے ان چھٹیوں میں کبھی ماں باپ کے ساتھ جاتے بھی ہیں اور کبھی نہیں جاتے۔

بچہ پیدا ہونے کے چھ ہفتے بعد تک زچہ اسپتال میں رکھی جاتی ہے اور پھر چھ مہینے تک آدھے دن

...ام لیا جاتا ہے۔ باقی آدھے دن وہ نرسری میں اپنے اور دوسرے بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ چھ مہینے ...ا ہو جانے کے بعد بچہ نرسری سے بچوں کے گاؤں بھیجدیا جاتا ہے۔ بچوں کی غذا، صحت، کھیل کود وغیرہ پر ...خت توجہ دیجاتی ہے۔ غواآط میں بچوں کی اموات کا اوسط چھبیس فی ہزار ہے جو دُنیا میں سب ملکوں ...ے کم ہے، خود پورے فلسطین کا اوسط چوالیس فی ہزار ہے۔ غواآط کا طبّی انتظام بھی اپنا ہے، اسپتال ...ں پندرہ بڑے اور تیرہ بچوں کے پلنگ ہیں۔

غواآط میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم لازمی ہے۔ ثانوی تعلیم کو ناقابل ترک سمجھا جاتا ہے۔ مگر ...دہ سال کی عمر ہونے پر لڑکے لڑکیاں کھیت یا فیکٹری میں بھی کچھ وقت صرف کرتے اور سیکھتے ہیں۔ اٹھارہ ...سال کی عمر ہونے پر لڑکا یا لڑکی خود طے کرتے ہیں کہ ان کو وہاں رہنا ہے یا کہیں اور۔ ماں باپ مشورہ ...ے سکتے ہیں مگر جبر نہیں کر سکتے، جاکر پھر آجانا ممنوع نہیں ہے۔ نئے آنے والے کو ایک سال تک جانچا ...جاتا ہے کہ وہ مشترک زندگی کے لئے بنا بھی ہے یا نہیں اور اگر وہ موزوں سمجھا جاتا ہے تو گاؤں سماج کا ...ممبر بنالیا جاتا ہے۔ سب سے بڑی جانچ اس بات کی کیجاتی ہے کہ نئے ممبر میں "سمجھوتہ" کرنے کی اسپرٹ ...ہے یا نہیں۔

سکریٹری نے بتایا کہ:-

"یہ نظام ہماری زندگی کی ساری سہولتیں فراہم کر دیتا ہے۔ ہمارا مستقبل محفوظ اور یقینی ہے، رہنے کو مکان ہے، کھانے کو ہر چیز ہے، پہننے کو کپڑے ہیں اور جوتا، بچوں کی تربیت، تعلیم اور معالجے کی ہمیں فکر نہیں، اور بے روزگاری کا اندیشہ نہیں اور چونکہ ہمارے کاندھوں سے سارا بوجھ اُتار لیا ہے، ہمارے پاس کلچری مشاغل کے لئے بھی وقت رہتا ہے۔"

ایک دوسرے منتظم نے کہا کہ:-

"ہم عمارتوں وغیرہ پر جتنا زیادہ خرچ کرتے ہیں اسی مناسبت سے ہماری آمدنی بڑھتی اور کلچری معیار اونچا ہوتا ہے۔"

یقیناً غواآط کے لوگوں کا کلچری معیار دُنیا بھر کے دیہات سے بہت اونچا ہے۔ بارہ سو پچاس آدمیوں ...بستی کے لئے ایک لائبریری ہے جس میں بیس ہزار کتابیں ہیں، لائبریری کی عمارت میں بڑوں اور بچوں ...کے مطالعے کے چھ کمرے ہیں، جن میں اخبار اور رسالے بھی رکھے رہتے ہیں۔ ہال میں چھ سو آدمی بیٹھ ...سکتے ہیں جس میں ایک اسٹیج بھی ہے۔ اور تل ابیب سے ڈراما کمپنی اکثر آتی رہتی ہے۔ ڈانس اکثر ...ہوتے ہیں، خود گاؤں والوں نے چوبیس آدمی کا ایک ارکیسٹرا قایم کر رکھا ہے۔ ایک گاؤں والے نے

مجھسے فخریہ کہا کہ "ہمارے تو بوڑھے بھی رقص کئے بغیر نہیں رہتے!" اجتماعی رقص کی بھی مشق کرائی جاتی ہے، بوڑھوں اور بچوں، سب کے لئے کھیلوں کا انتظام ہے۔ تیراکی بہت زیادہ مقبول ہے۔ الغرض غواط شہری و دیہی زندگی کا بڑا دلکش امتزاج ہے۔

شادیاں گاؤں سے باہر بھی ہوتی ہیں۔ لڑکی شادی کرکے شوہر کے ساتھ چلی جاتی ہے اور لڑکے اپنی بیویوں کو غواط لے آتے ہیں۔

اِس گاؤں کا سماجی نظام اس لئے کامیاب ہے کہ جمہوریت کے اُصول پر پورا پورا عمل کیا جاتا ہے اس سوسائٹی پر اگر کسی کا تحکم ہے تو خود ان کا اپنا۔ ساری طاقت جنرل اسمبلی یا ٹاؤن میٹنگ کے ہاتھ میں ہے جو حسب ضرورت اجلاس کرتی رہتی ہے ہر سال ایک ایگزیکٹو چن لیا جاتا ہے، وہ سال بھر کا پلان بنا کر پیش کرتا ہے اس پلان پر اسمبلی میں بحث ہوکر ترمیم و اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اور پھر اس کی تعمیل شروع ہوجاتی ہے۔ ہر کام کے لئے ایک کمیٹی بن جاتی ہے۔

اس نئے سماج میں جس موضوع پر مطلق توجہ نہیں دیجاتی وہ سیاست ہے۔ چونکہ یہ تنظیم کسی سیاسی عقیدے کی تحت نہیں ہوئی بلکہ سماجی و اقتصادی بہبودی اس کا مقصد ہے، جسے وہ حاصل کرچکے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں، کوئی کسی کے سیاسی خیالات میں مزاحم نہیں ہوتا۔

غیر ملکی اخبار نویسوں نے غواط کی اس زندگی کو شہد کے چھتے کی زندگی سے تشبیہ دی ہے جہاں انفرادی خواہش کا وجود نہیں ہے۔ اس کا جواب غواط کے ایک بوڑھے کے ان لفظوں میں سنئے۔

"میں اگر دو چار ایکڑ زمین نجی طور پر کاشت کرتا ہوتا تو مجھے ڈراما دیکھنے یا ارکیسٹرا سننے تل عفیف جانا پڑتا، مگر چونکہ میں مشترک سماج اور زراعت کا ممبر ہوں ڈراما کمپنی اور آرکیسٹرا میرے یہاں چلے آتے ہیں۔"

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے سوشلسٹ نظام کا جس میں کامل طور پر امداد باہمی کے اصول پر کام ہوتا ہے ملک کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کا جواب ظن وتخمین ہی سے دیا جاسکتا ہے میرا پختہ خیال ہے کہ بستیاں بسانے میں اگر روپیہ کی افراط ہو تو یہ کامیابی ہرگز نہ ہوگی، غواط کی کامیابی لوگوں کی محنت مشقت کا نتیجہ ہے۔ غواط کی اسکیم تجربے کی حد سے باہر نکل چکی، اور محنت و قربانی کی منزل پر آچکی ہے۔ آج غواط جس منزل میں ہے وہاں پہونچ کر یہ سوال ہونے لگتا ہے کہ انسان صرف روٹی ہی کیلئے نہیں جیتا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے دلوں میں یہ آرزو بھی پیدا ہوگئی ہے کہ مکان بہتر ہو اس کی آرائش اچھی ہو، اپنا ریڈیو اور ریفریجریٹر ہو، وہ لوگوں کی دعوتیں کریں اور

خود دعوتوں میں جائیں ایسی ایسی چھوٹی چھوٹی بہت سی خواہشیں پیدا ہوسکتی ہیں۔ اس وقت میرے خیال کے مطابق تقسیم نقد کی ضرورت کا وقت ضرور آئے گا۔ میرے اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ فلسطینی لیڈروں نے غالبًا یہی اندازہ کرکے ایک نئی قسم کے گاؤں بسانا شروع کردیا ہے ایسے گاؤں میں کاشت تو مشترک محنت سے ہوتی ہے مگر ماحصل افراد میں بٹ جاتا ہے تاکہ حسب منشاء و مرضی اسے خرچ کرسکیں۔

غواطے تل عفیف پلٹتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ مصر و ایران اس اسکیم پر عمل کرکے کس قدر نفع اُٹھا سکتے ہیں، ان ملکوں کا کسان اشتراکی محنت کو ہرچند پسند نہیں کرے گا مگر اسے اس کی کتنی شدید ضرورت ہے، مویشی کی نسل سدھارنے کی ضرورت ہے، اچھے بیجوں کے انتظام کی ضرورت ہے، کھیتی اور انسانوں کی بیماریوں سے جنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم پھیلانے کی ضرورت ہے اور گھریلو دستکاریوں کے نفع کا پورا احساس کرنے کی ضرورت ہے!


## ہمارے چند مطبوعات

**علامہ شبلی:-**
سفرنامہ مصر روم و شام۔ دو روپیہ
اسلامی مدارس ۔۔۔ چھ آنے
اسلامی حکومت ۔۔۔ پانچ آنے
زیب النساء ۔۔۔۔ تین آنے

**امیر احمد علوی:-**
تاریخ اندور ۔۔۔۔ ایک روپیہ
سفر سعادت ۔۔۔ ایک روپیہ آٹھ آنہ

**احد علی:-**
شباب لکھنؤ ۔۔ دو روپیہ آٹھ آنے
مرقع اودھ ۔۔۔۔ بارہ آنے

**ندر بودھاموی:-**
انتخاب نقیب ۔۔۔۔ آٹھ آنے

خطاب ۔۔۔۔۔۔ چھ آنے

**عبدالحق:-**
اساس التعلیم ۔۔۔۔ تین روپے

**اختر جوناگڈھی:-**
اسلامی کتب خانے ۔۔ چھ آنے
حیات نظامی ۔۔۔۔ آٹھ آنے

**مہدی بھوپالی:-**
انسان ۔۔۔۔۔ دس آنے
رموز فطرت ۔۔۔۔ دو روپے

**علامہ حالی:-**
دیوان حالی ۔۔۔۔۔ دو روپے

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

حب وطن ۔۔۔۔۔ دو آنے
مسدس تنگ خدمت ۔۔۔ دو آنے

**عبدالماجد دریابادی:-**
زود پشیماں ۔۔۔۔ بارہ آنے

**شوق قدوائی:-**
عالم خیال ۔۔۔۔۔ بارہ آنے
قاسم وزہرا ۔۔ بارہ آنہ و ایک روپیہ

**مرزا رسوا بی، اے:-**
مثنوی امید و بیم ۔۔۔ چھ آنے
نوبہار ۔۔۔۔۔ دو آنے

**غلام اسیر بدایونی:-**
بہترین غزل گو ۔۔۔ چار آنے
سوامی دیانند کی لائف ۔ ایک روپیہ

# چودھواں باب

## (زمین کی حیاتِ نو)

یہ خیال عام ہے کہ شہری لوگ جسمانی مشقت پسند نہیں کرتے۔ اپنے پرانے تجربے کی بنا پر میں بھی اسی خیال کا تھا۔ لیکن غواآط برنیر کے تقریباً سارے باشندے شہروں کے رہنے والے تھے، فلسطین پہونچنے سے پہلے انھیں کدال پھاوڑے کا فرق بھی شاید معلوم نہ ہو۔ لیکن بیس سال کی مدت میں انھیں لوگوں نے محنت کا معجزہ کر دکھایا۔ بظاہر غواآط کی بستی ایک معما نظر آتی ہے، لیکن حقیقت میں ایسا ہے نہیں پڑھا لکھا آدمی اگر ارادہ کرکے دیہاتی زندگی اختیار کرلے تو سائنسی طریقوں پر عمل کرنے میں اسے تکلف نہیں ہوگا اور اس کی ذہانت اسے ایک بہتر کاشتکار بنا سکتی ہے۔ چنانچہ غواآط کے ان کاشتکاروں کے ایک ہاتھ میں کھرپا اور دوسرے میں کتاب تھی۔ جس سرزمین پر وہ آپڑے تھے، قدرتاً انھیں اس سے گہرا لگاؤ ہونا چاہئے۔ اپنی زندگیوں کو نیا جنم دینے کا عزم بھی ان کے اندر لازمی تھا۔ سائنس کے ماہرین کے مشورے انھیں حاصل تھے۔ باہر سے مالی امداد بھی ان کے دست رس میں تھی۔ یہ تمام باتیں انکا قیمتی سرمایہ تھیں۔ بایں ہمہ ان کے پاس اگر جدید ترین مشینیں نہ ہوتیں تو ان کی کامیابی اتنی مکمل نہ ہوتی۔

ظاہر ہے کہ ان کے عرب ہمسائے خود تاریخ کے مجروح تھے اور ان کو کچھ سکھا نہ سکتے تھے۔ دیسی مویشی ویسے ہی خراب حالت میں تھے۔ جیسی فلسطین کی زمین، دودھ کا سالانہ اوسط فی مویشی تقریباً ساڑھے پندرہ سو پونڈ تھا (امریکہ کی گائے کا اوسط ساڑھے آٹھ ہزار پونڈ ہے اور ڈیری کا مالک ایسی گائے کو اپنے گلّے سے نکال دیتا ہے جو سال میں ساڑھے تین سو پونڈ مکھن نہ دیتی ہو) فلسطین کے نوآبادکاروں کے لئے بھی کم دودھ والے مویشی بے کار تھے۔ شام و لبنان کے مویشی بہتر ضرور تھے مگر تجارتی نقطۂ نظر سے وہ بھی کارآمد نہ ہوسکتے تھے۔ یورپ سے عمدہ نسل کے مویشی بآسانی منگائے جاسکتے تھے مگر تبدیل آب و ہوا کی وجہ سے وہ زیادہ مفید ثابت نہ ہوسکتے، ولندیزی گائے کچھ مناسب ثابت ہوئی

مگر کثیر تعداد میں لاکر بسائی نہ جاسکتی تھی۔ ان حالات میں یہودی سائنسدانوں کو طے کرنا پڑا کہ فلسطین کے لئے انھیں ایک مناسب مویشی پیدا کرنا ہے۔ چنانچہ ولندیزی سانڈ اور شامی گائے سے جو نسل طیار ہوئی وہ قابل اطمینان نکلی۔ اس کے دودھ کا اوسط نو ہزار پونڈ ہے اور اس وجہ سے فلسطین میں ڈیری کی صنعت نہایت کامیاب ہے۔ فلسطینی عرب بھی اگر اپنے مویشیوں کی نسل اسی طرح بنالیں تو بلاشبہ فلسطین میں دودھ کی نہریں بہنے لگیں۔ دوران جنگ میں عربوں نے کچھ حوصلہ دکھایا اور نئی قسم کے مویشی فراہم کئے مگر بالآخر چھوڑ بیٹھے۔ بڑے مویشی کی طرح یہودی نو آباد کاروں نے بھیڑ بکری کی نسلیں بھی سدھاری ہیں۔ لیکن بکری جو نہ صرف کھیتی بلکہ جنگل کو بھی نقصان پہونچاتی ہے، مقبول نہیں ہوئی۔

ان یہودی نو آباد کاروں نے ترقی کی کوئی صورت نظر انداز نہیں ہونے دی۔ مرغی پالنے کے کام کو بھی بہت کامیاب بنالیا اور ڈیری فارم کی طرح یہ بھی بہت نفع بخش ثابت ہوا ہے۔

مویشی کی نسل کو بہتر بنانے کا کام اتنا مشکل نہیں تھا جتنا فلسطین کی زمین کو نئی زندگی دے کر زرخیز بنانا، زمین کی سطح صدیوں تک بارش سے دُھل دُھل کر طاقت کھوتی رہی اور قوی بنانے کی کسی صورت پر عمل ہوا نہیں اس لئے بنجر ہو کر رہ گئی۔ اس کے لئے عربوں کو ملزم بھی نہیں گردانا جاسکتا۔ صلیبی جنگوں کے زمانے سے یہ ملک تباہ برباد ہوتا رہا ہے۔ مغلوں کی یلغار نے بے شمار عرب کاشتکاروں کو خانہ بدوشی کی زندگی پر مجبور کردیا اور زمینیں بے وارث پڑی رہیں۔ ترکوں نے چار سو برس حکومت کی مگر عرب کاشتکار کی ہمت افزائی نہیں ہوئی۔ بلکہ آفندی (زمیندار) اس کا خون چوستا رہا۔ ترکی حکومت کے عمالوں نے بھی آراضی کی تباہی کے سارے اسباب پیدا کردئے۔ ۱۹۰۹ء میں ٹی ای لارنس نے عرب ملکوں کا سفر کیا اور ان ملکوں کی بربادی دیکھ خوف زدہ ہوگیا۔ لیکن یہودیوں کی نو آبادیاں دیکھ کر اسے نجات کی صورت دکھائی پڑی۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

> "ان کی (یہودیوں کی) کامیابیاں لامحالہ عربوں کو بھی ایک دن اسی جگہ لے آئیں گی۔ اور اسوقت عرب دُنیا کی اہمیت بہت بڑھ جائے گی۔ یہودیوں سے عربوں کو تکنیکی مدد ملسکتی ہے اور وہ اس طرح صنعتی یورپ سے بے نیاز ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان ملکوں کی ایک کنفڈریشن وجود میں آکر ایکروز "ورلڈ پاور" بن جائے۔"

ملیریا ایک عام وباء کی صورت رکھتا تھا۔ یہودی نو آباد کاروں نے آتے ہی دلدلوں کو خشک کرنے کا کام شروع کردیا۔ اس کام کو انجام دینے میں خود بھی ملیریا کا شکار ہوئے، مگر سمجھتے تھے کہ اس بلا کو دفع کئے بغیر جینا محال ہوگا۔ چنانچہ یہ جنگ ساٹھ سال تک لڑی جاتی رہی۔ آج ایک آدھ علاقے کو چھوڑ کر باقی

تمام دلدلیں خشک کر کے ملیریا کے مچھر کو ختم کر دیا گیا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ملیریا نے بائیس فیصدی آبادی کو متاثر کیا تھا اور ۱۹۴۶ء میں صرف دو فیصدی اس بخار میں مبتلا ہوئے۔

یہودیوں کو اس فتح سے جتنا فائدہ پہونچا اتنا ہی عربوں کو پہونچا۔ فلسطین کے کسان اب مصر، عراق اور ایران کے کسانوں کی طرح ملیریا کا شکار نہیں ہوتے۔

دلدلیں خشک کر دینے سے یہی فائدہ نہیں ہوا کہ ملیریا دفع ہو سکا بلکہ ایسا کرنے سے کافی بڑا رقبہ کاشت کے لئے دستیاب ہو گیا۔ چھوٹے سے ملک میں سوا لاکھ ایکڑ زمین کا اس طرح ملجانا بہت بڑی بات ہے جس علاقے میں دلدلیں ابھی تک خشک نہیں کی گئی ہیں وہ حُلّہ کا علاقہ ہے اور ان دلدلوں کا رقبہ اٹھارہ ہزار میل کا ہے۔ حُلّہ جھیل کا علاقہ اور شاداب ہے کیونکہ بارش کافی ہوتی ہے۔ اب اس جھیل میں مچھلیاں پرورش کرنے کی اسکیم جاری کی جانے والی ہے۔ اس علاقے کی آبادی پندرہ ہزار ہے جس میں پانچ ہزار یہودی اور دس ہزار عرب ہیں۔

فلسطین میں زمین سے متعلق سارے کام تقریباً انجام پا چکے ہیں۔ چٹانوں کو کھود کر نکال پھینک دیا گیا ہے ڈھلان مسطح کر دئے گئے ہیں۔ روخامہ کے علاقے کی زمین کو اب بارش کا پانی بہا کر نہیں لے جائے گا۔۔۔ کھاری والی زمینوں کو پاک کر کے قابل زراعت بنا لیا گیا ہے۔

تمام زمینوں کو قابل زراعت بنانے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ پانی کی تلاش بھی جاری تھی — ان نوآبادکاروں سے پہلے آبپاشی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ جھیلوں، ندیوں اور چشموں سے معقول کام لیا ہی نہ جاتا تھا۔ اتھلے کنوؤں سے کچھ آبپاشی ہوتی تھی مگر زمین کی تہ کا پانی ان میں سے بھی نہیں نکالا گیا تھا۔ ۱۹۳۶ء میں "یہودی نیشنل فنڈ" نے پیمایش کر کے بتایا کہ زیر زمین بہت کافی مقدار میں پانی موجود ہے، اور بآسانی چار لاکھ ایکڑ کی زمین کی آبپاشی ہو سکتی ہے۔ اس وقت تک صرف سوا لاکھ ایکڑ زمین پر آبپاشی ہوتی ہے اور ان زمینوں پر ایک سے زیادہ فصلیں بوئی جاتی ہیں۔ بدل بدل کے فصل پیدا کرنا جدید دریافت ہے، فلسطین میں اس پر عمل کر کے زمین کی طاقت اور زرخیزی کو بڑھایا جا رہا ہے۔ نارنگی فلسطین کی پرانی پیداوار ہے مگر یہودی نوآبادکاروں سے پہلے نارنگی کی کاشت کے امکانات کا اندازہ نہیں کیا گیا تھا کہ چٹان میں سونا چھپا ہوا ہے۔

نارنگی کو فلسطین میں شموتی کہتے ہیں، شکل اور ذائقہ دونوں طرح سے نہایت اچھا پھل ہے اور دُنیا بھر میں اس کی مانگ ہو سکتی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں ساڑھے سات ہزار ایکڑ پر نارنگی کی کاشت ہوتی تھی، ۱۹۴۸ء میں دس گنا تھی۔ عرب کے لوگ پھلوں کا "گریڈنگ" ان کا پیکنگ اور شپنگ نہیں جانتے تھے،

یہودیوں نے آکر یہ طریقے اختیار کئے تو پیداوار اور برآمد بڑھ گئی اور عربوں کو بھی اتنا ہی فائدہ پہونچا۔ عرب لوگ سنہ ۲۲ء میں ساڑھے چار ہزار ایکڑ زمین پر نارنگی بوتے تھے۔ آج وہی اُنتالیس ہزار ایکڑ پر بو رہے ہیں۔ یہودیوں نے آکر ویلنشیا کی قلم امریکہ سے منگائی اور وہ بہت کامیاب رہی ان کو دیکھ کر عربوں نے بھی ویلنشیا کی کاشت شروع کی ہے، یہودیوں نے گریپ فروٹ لگاکر بھی کامیابی حاصل کی ہے مگر عرب ابھی دیکھ ہی رہا ہے۔

جنگ کی وجہ سے سٹرس (بڑا لیمو) کی تجارت کو بڑا دھکا لگا۔ کیونکہ یورپ کی طرف برآمد رک گئی تھی اور یہودیوں نے اس کے درخت اُکھڑوا کر دوسری کاشت شروع کر دی تھی۔ اب سٹرس کی مانگ پھر بڑھ جائے گی۔ اور چونکہ اس کی پیداوار کے لئے زمین، پانی اور آب و ہوا سب موافق ہے اس لئے لاگت کم آتی اور قیمت اچھی ملتی ہے۔

زیتون کی کاشت پر یہودی نوآبادکاروں نے توجہ نہیں دی ہے۔ زیتون کا درخت بارہ سال میں پھل دیتا ہے۔ ڈیڑھ لاکھ ایکڑ پر زیتون ہوتا ہے، اس میں یہودیوں کا حصہ شاید ایک فیصدی ہو۔ اس طرح یہ کاشت آج بھی عرب کلچر ہے اور یہ ایک سائنسی حقیقت ہے کہ عرب لوگ اگر زیتون کے اتنے شیدا نہ ہوتے تو زمینیں زیادہ خراب ہو جاتیں۔

یہودی نوآبادکاروں نے دُنیا بھر سے بہترین قلمیں منگا کر سیب، آلو بخارا، آڑو وغیرہ کی کاشت بڑھائی ہے۔ پہلے فلسطین میں یہ پھل غیر معلوم تھے۔ کیلا بھی یہودی لائے۔ اب ان نوآبادکاروں نے آم اننناس اور پپیتا وغیرہ بھی لگائے ہیں۔

اسی طرح ان لوگوں نے فلسطین میں ہر قسم کی سبزیاں اور ترکاریاں بھی پیدا کر لی ہیں۔ آلو کو انھوں نے تجارتی پیداوار بنا لیا ہے اور اب عرب لوگ بھی آلو بونے لگے ہیں۔

سنہ ۲۱ء سے سنہ ۳۳ء تک کی مدت میں عرب کاشتکاری نے بڑی ترقی کی لیکن یہودی کاشت کے مقابلہ میں ان کی پیداوار کا اوسط کم رہتا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، آفندی کبھی آکر اپنی زمین کو دیکھتا بھی نہیں اور وصولی کے علاوہ زمین پر روپیہ لگانا غیر ضروری سمجھتا ہے۔ چند زمینداروں نے کچھ مشینیں منگائی بھی ہیں، مگر معمولی فلاح مشینیں، کھاد اور اچھا بیج کہاں سے منگائے، اس کی آمدنی اگر اپنی زمین جوتتا ہے تو ایکسو چالیس امریکن ڈالر اور بٹائی پر کاشت کرتا ہے تو اسّی ڈالر فی ایکڑ ہے۔ ان مجبوریوں کے علاوہ اسکی قدامت پرستی کا ورثہ ایک اور رکاوٹ ہے............ وہ عرب کاشتکار جن کے آس پاس یہودی کاشت نہیں ہوتی اپنے ڈھنگوں کو بدلدے، ذرا دشوار نظر آتا ہے۔

فلسطین کی زمین غلّے کی کاشت کے لئے غیر موزوں ہے مگر یہودی کی طرح عرب کو بھی پیٹ تو بھرنا
لیکن وہ اس میں بھی ترقی نہیں کرسکتا کیونکہ نہ تو گہرا ہل چلاتا ہے نہ اچھا بیج میسر ہے اور نہ کھاد دیسکتا
چونکہ یہودی کاشتکار کے ذہن و دماغ پر قدیم روایات کا بوجھ نہ تھا، وہ وسیع پیمانے پر مشینوں
کا استعمال کرکے، بدل بدل کر فصلیں پیدا کرکے، عمدہ بیج ڈال کر اور کھاد کے استعمال سے چھوٹے سے
رقبے میں زیادہ پیداوار کرلیتا ہے۔ ان دونوں میں فرق ظاہر ہے، ایک لکڑی کا دقیانوسی ہل چلاتا ہے
—— دوسرا فولادی ہل استعمال کرتا ہے، ایک بیل سے کام لیتا ہے، دوسرا ٹرکیٹر سے!

عہد توراۃ و انجیل میں فلسطین کی سرزمین پر شہد کی نہریں بہتی تھیں مگر درمیان کی صدیوں میں ا
سوتے سوکھتے گئے، آج اس زمانے کو پھر سے زندہ کیا جارہا ہے، ۱۹۴۸ء میں یہودی کاشتکاروں
نے چھبیس ہزار چھتّے پال کر ساڑھے بارہ لاکھ پونڈ شہد پیدا کیا تھا۔

قوم اسرائیل نے تہیہ کرلیا ہے کہ سرزمین فلسطین کے ہر ذریعے کو ترقی دیکر پورا فایدہ اُٹھایا جائے۔
اسی مقصد سے اب وہاں مچھلی کی پیداوار بھی بڑھائی جارہی ہے۔ جلیلی کے سمندر میں ۱۹۳۷ء سے مچھلیوں
کی پرورش شروع ہوئی، مگر اب بحر روم سے بھی مچھلی پکڑی جارہی ہے۔ اندرون ملک کی جھیلوں میں
مچھلیاں پرورش پا رہی ہیں۔

ایک نسل کی مدت میں یہودی مہاجرین نے ارض مقدس کو پورے مشرق وسطیٰ میں سب سے زیاد
زرخیز علاقہ بنا دیا ہے، بنجر زمینوں سے دو دو تین تین فصلیں لے رہے ہیں۔ زمین کو یہ نئی زندگی اسوقت
ملی ہے جب ان نوآبادکاروں نے اپنی جانیں کھپا دی ہیں، وباؤں سے جنگ کرنے میں جانوں کی قربانیا
دی ہیں۔

عربوں اور یہودیوں میں کیسی بھی عداوت ہو مگر یہودی نوآبادکاروں کا یہ کارنامہ ایک تاریخ
حقیقت ہے، مشرق وسطیٰ میں ان لوگوں نے تاریخ کو پلٹ دیا ہے! ان کے اس کارنامہ سے عربوں کو بھی فا
پہونچا ہے۔ اور جو کارنامہ انھوں نے فلسطین میں کر دکھایا ہے، وہی عراق، سعودی عرب، ایران اور مصر م
بھی دکھایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ کوئی طاقت رونما ہوکر مسلمانوں کی کاہلی اور جہالت کی دیوار کو ڈھا دے
اور مسلم فلاح کی تخلیقی قوت برسرِعمل ہو جائے!

میں عرب طلبہ سے امریکہ اور دوسرے ملکوں میں ملا ہوں، میں نے مسلم ملکوں میں سیاحت کرکے عر
نوجوانوں کی باتیں سنی ہیں اور ان کے ولولے اور آرزوؤں سے متاثر ہوا ہوں۔ عرب طالب علم غیر ملکوں
فارغ التحصیل ہوکر جب اپنے وطن پہونچیں تو ان کو "درکان نمک" ہوجانے سے بچانے کی ضرورت

نوجوان علم وفن کی آرزو رکھتے ہیں ان کو حصول فن کے لئے غیر ملکوں میں بھیجنے کی ضرورت ہے، اور جو امریکہ یا یورپ نہیں جا سکتے انھیں فلسطین بھیجا جا سکتا ہے جہاں سے واپسی پر یہ نوجوان اپنے ملکوں کو فلسطین کی طرح شاداب وزرخیز بنا سکیں گے، اپنے عوام کی تخلیقی قوتوں کو مہمیز دے سکیں گے۔ عرب ملکوں کی نئی نسل کے لئے بہترین تعلیم وتجربہ گاہ ثابت ہو سکتی ہے، وہ وہاں نظریاتی اور عملی طور پر سائنسی طریقوں سے زمین کو زرخیز بنانا سیکھ سکیں گے۔ فلسطین کی امداد باہمی کے اصول پر بنی ہوئی بستیاں یورپ کے تعلیم یافتہ یہودیوں کو اگر ماہر کاشتکار بنا سکتی ہیں تو عرب نوجوانوں کو بھی بنا سکتی ہیں۔

میں دقتوں سے بے خبر نہیں ہوں، اس میں عملی مشکلیں ہیں، کلچری رکاوٹیں ہیں، اور ڈپلومیٹک دشواریاں ہیں۔ لیکن یہ دشواریاں دور ہو سکتی ہیں بشرطیکہ دونوں طرف کے لیڈر انھیں دور کرنے کا ارادہ کر لیں۔

ان دشواریوں کو دور کرنے میں غیر ملکی ڈپلومیٹ اگر یہود وعرب کی عداوت کو بڑھانے کے بدلے اسے کم کرنے میں لگ جائیں تو فلسطین میں مسلم نوجوانوں کو تعلیم کی بڑی آسانیاں مل سکتی ہیں۔ اور تمام مسلم ممالک کی اقتصادی ومعاشی دشواریاں دور ہو سکتی ہیں۔

یہود وعرب کی باہمی کشاکش کے متعلق برطانوی رائل کمیشن کی رپورٹ کا مندرجہ ذیل اقتباس بڑی توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے:۔

(۱) ”فلسطین میں یہودی سرمائے کی درآمد نے پورے ملک کی بحالی پر اثر ڈالا ہے۔

(۲) عربوں کی سٹرس پیداوار میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی اس کا باعث یہودی سرمایہ کی درآمد ہے۔

(۳) یہودی کاشت کی ترقی عرب کاشت کو اور خاص کر سٹرس کی کاشت کو مہمیز دے رہی ہے۔

(۴) یہودیوں کی صنعتی وزرعی ترقی نے بہت سے عرب مزدوروں کو روزگار فراہم کیا اور شہروں بالخصوص بندرگاہوں کی ترقی کا باعث ہوئی۔

(۵) بنجر زمینوں کو قابل کاشت بنانے اور بیماریوں کو دفع کرنے میں کامیاب ہو کر یہودی نوآبادکاروں نے عربوں کو بھی فائدہ پہونچایا ہے۔

(۶) ”نیشنل (یہودی) ہوم“ کے فنڈ نے رفاہ عام کے لئے جو ادارے قایم کئے ان اداروں نے عرب آبادی کی بھی اتنی ہی خدمت کی جتنی یہودیوں کی۔ حداسہ کے اسپتال میں عرب مریضوں کا علاج بھی پوری دیانت کے ساتھ ہوتا ہے، صفاد کے دق کے اسپتال میں اور ریڈیولاجی انسٹی ٹیوٹ میں عرب مریض بھی بھرتی کئے جاتے ہیں۔ دیہاتی بیماروں

کے فنڈ سے جو کلینک جاری ہیں وہاں عرب مریضوں کا علاج بھی کیا جاتا ہے اور بچوں کی تحفظ کے کاموں میں عرب بچوں کی بھی خدمت کی جاتی ہے۔

(۷) فلسطین میں یہودیوں کے آنے سے عربوں کو کتنا فایدہ پہونچا وہ اس حقیقت سے ثابت ہے کہ جن شہروں میں یہودیوں نے ترقی کے کام شروع کئے وہاں عربوں کی آبادی بہت بڑھ گئی حیفہ کی آبادی بمقابلہ سنہ ۲۲ء کے سنہ ۳۱ء میں چھیاسی فیصدی اور یروشلم کی سینتیس فیصدی بڑھ گئی۔ اسی زمانے میں خالص عرب آبادی کے شہروں میں صرف سات فیصدی اضافہ ہوا۔ غازہ میں تو آبادی دو فیصدی گھٹ گئی ہے۔

اس رپورٹ کا ایک نہایت اہم حصہ یہ بھی ہے :-

"عرب کاریگر کی مزدوری اب ڈھائی سو سے چھ سو پل اور غیر کاریگر کی سو سے ایکسو اسی پل روزانہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں شام میں سرسٹھ سے ایکسو چوبیس پل تک ہے، عراق میں فیکٹری مزدور کی مزدوری چالیس سے ساٹھ پل روزانہ ہے"

عرب اور یہودیوں کی مسلسل عداوت کے ہوتے ہوئے اگر عربوں کو یہ فواید پہونچ سکتے ہیں تو قیاس کیا جاسکتا ہے کہ دوستی و رفاقت ہو جانے سے کتنا فایدہ پہونچے گا۔

---


## ہمارے چند مطبوعات

**قواعد المنتخب** :- از جلال لکھنوی مع تقریظ مولانا عبد الماجد دریابادی۔ پاکیزہ اور فصیح زبان لکھنے میں قدرت حاصل کیجا سکتی ہے۔ آٹھ آنہ

**ازواج الانبیاء** :- مولانا مجوی ازواج مطہرات کی عظمت و عقیدت کا سکہ دل میں بٹھا دیتے ہیں ------ دو روپیہ آٹھ آنہ

**اسرار رنگون** :- برمی سیاح نے برمی معاشرت کی عکاسی کی ہو بطور ناول اور یہ چاشنی عشق ! ----- ایک روپیہ آٹھ آنہ

**البیرونی** :- برنی نے ابو ریحان بیرونی کے مکمل و مستند حالات کو پیش کرکے ـــ خلا کو پر کر دیا ہے ------ دو روپے

**امداد باہمی** :- از اظہر علی علوی، معاشیات ہند ـــ ہند کے شہریوں کو آواز دیتی ہے کہ باہمی امداد و تعاون سے معاشی بحران کو دور کیا جائے ------ پانچ روپے

**باغ فردوس** :- انیس کے شاگرد عزیز فردوس نے اپنی جودت طبع سے فسانۂ عجائب کو نظم کیا، فسانہ کی رنگینی، شعری لباس میں آکر اور نکھر اٹھی ہے ----- ایک روپیہ چار آنے

**تاریخ امریکہ** :- از یحیٰی تنہا۔ دنیا میں امریکہ کی اہمیت روشن، اور امریکی معاشرت، فطرت اور انکی حب الوطنی قابل دید ہو -- دو روپیہ آٹھ آنہ

**ترقی زبان** :- پروفیسر گھوشالی ماہر لسانیات کا لکچر -- پانچ آنے

**حرز جان** :- از ظفر الملک مرحوم نے حفظ بلیات و امراض کا وظیفہ۔ دو آنہ

**الناظر بک ایجنسی لکھنؤ**

# پندرھواں باب

## (لشکروں کا لشکر)

تل عفیف پہونچنے سے پہلے ہستادروت کا نام میں نے سُنا بھی نہ تھا۔ یہ نام ہے (فلسطین کی یہودی ٹریڈیونین) کا۔ لیکن یہ ایک ایسی جماعت کا نام ہے کہ تل عفیف پہونچ کر ناممکن ہے کہ کوئی اس سے بےخبر رہے۔ اس سے بے خبر رہنا گویا بحرِ روم کے وجود سے بے خبر رہنا ہے۔ میں جہاں جاتا تھا ہستادروت کی علامتیں اس طرح سامنے آتی تھیں جیسے بحرِ روم کی لہریں۔

مزدور تنظیم کی یہ نوعیت دیکھنا کیا تصور میں آنے والی بات بھی نہ تھی۔ اس مزدور تنظیم نے اپنے سر جس قدر ذمہ داریاں لی ہیں اور جو تخلیقی اسپرٹ دکھائی ہے اور اس اسپرٹ کا جو کامیاب عمل ہوا ہے اس کی مثال کہیں دنیا میں نہیں ملتی۔

یہ جماعت جس کا نام ہستادروت ہے مزدور جماعت بھی ہے اور سرمایہ داری ادارہ بھی۔ یہ بیک وقت دونوں کی نمائندہ ہے۔ وہ فلسطین میں سب سے زیادہ مزدوروں سے کام لینے والا کارخانہ دار ہے مگر مزدور مفاد کا محافظ بھی ہے۔ اس ادارے کی بہت سی فیکٹریاں اور کارخانے چل رہے ہیں اور تجارت وصنعت کی ترقی کے خیال سے بہت سی فیکٹریوں اور ملوں میں حصہ دار بھی ہے۔ دوسرے کارخانہ داروں سے تعاون کرکے ہستادروت نے شہر بیرشیبا کی تعلیم کے لئے ایک فنڈ اکٹھا کرلیا ہے جہاں دس ہزار کی آبادی ہے۔ سنیٹرل ٹریڈ اینڈ انوسٹیمنٹ کمپنی کی شرکت میں، ہستادروت نے حیفہ کے اندر ایک سیمنٹ فیکٹری قایم کی ہے۔ فنی شن کا کانچ کا کارخانہ فیل ہوچکا تھا، ہستادروت نے اسکے مالک سے خرید لیا اور مزید سرمایہ لگاکر اسے بالکل جدید سائنسی طریقے پر چلایا۔ آج شیشے کی چادریں بنانے کا یہ بہترین کارخانہ ہے۔ تعمیرات کا کام بھی بہت بڑے پیمانے پر جاری ہے اور مشینوں سے جوتا، اینٹ، صابن، تیل اور کاسمیٹک وغیرہ بنانے کی فیکٹریاں بھی کام کررہی ہیں۔

ہستادروت، نجی ملکیت کے حق میں بھی ہے وہ پیداوار بڑھاتا ہے تو اس کی تقسیم بھی صحیح کرتا ہے، خدمت کرتا ہے تو جذبۂ مسابقت بھی پیدا کرتا ہے، وہ عام تاجروں کی طرح اپنے حریف تاجر کو نقصان بھی پہونچا دیتا ہے اور اسے کمزور کر کے نگل بھی جاتا ہے۔ اس نے کارخانہ دار اور تاجر کی حیثیت سے جو وقار و رسوخ حاصل کیا ہے وہ حقیقتاً تجارتی فراست اور ہوش مندی کا بہترین مظاہرہ ہے، سامان طیار کرنے اور اس کی تقسیم کرنے والے کی حیثیت سے ہستادروت کی طاقت بے حد بڑھ گئی ہے، اسی وجہ سے اس کے حرکت و عمل کی بھی حد نہیں رہی ہے۔ وہ مہاجن اور بینکر بھی ہے اور بچت کرا کے ڈپازٹ کرنے اور قرضے دینے کی متعدد سوسائٹیاں بھی اس نے جاری کر رکھی ہیں۔ اس کے کئی چھاپے خانے بھی ہیں اور اسکے متعدد اخبار، رسالے اور پمفلٹ بھی ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لئے، لڑکوں کے لئے اور بالغوں کے لئے اسکول کھول رکھے ہیں، تکنیکی تعلیم کا بھی انسٹی ٹیوٹ جاری ہے۔ تل عقیف میں اس کا اپنا تھیئٹر ہے جہاں ہر قسم کے ڈرامے کھیلے جاتے ہیں۔ وہ اسپورٹس (کھیل) کی بھی ہمت افزائی کرتا ہے۔ "یہود ایجنسی" کے تعاون سے اس نے ایک ٹریننگ اسکول جہازیوں کی تعلیم کے لئے کھول رکھا ہے۔ دوسرا ہوا بازی کا اسکول چلا رہی ہے۔ ایک کارخانہ جہاز بنانے اور مرمت کرنے کا بھی چلا رہی ہے۔ مچھلیاں پکڑنے کے لئے اس نے چھوٹے چھوٹے جہاز خود بنوائے ہیں۔ کاشت کی مشینیں بنانے، چمڑہ رنگنے، ربڑ کا سامان طیار کرنے اور کپڑے کی انڈسٹری میں اسے خاص امتیاز حاصل ہے۔ چوری، آگ، زلزلہ، زندگی اور حادثہ وغیرہ کا بیمہ بھی کرتا ہے۔ فلسطین کے بائیس فیصدی مزدور، ہستادروت کے کارخانوں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ فلسطین میں جتنا سامان تجارت بنتا ہے اس کا پانچواں حصہ ہستادروت کی فیکٹریوں کا بنا ہوتا ہے۔

دُنیا کے اور ملکوں میں بدیسی مزدوروں کے داخلے پر پابندیاں ہیں، مزدور تحریکیں اس کی مخالفت کرتی ہیں، مگر یہ مزدور تنظیم ایسی ہے جو نئے آنے والوں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ نئے مزدوروں کے فلسطین میں آنے سے نہ تو وہاں کے پُرانے مزدوروں کی شرح مزدوری میں کمی آتی ہے، نہ ان کی اجتماعی طاقت میں کمزوری ہوتی ہے نہ بیروزگاری پھیلتی ہے۔

دُنیا بھر کی ٹریڈ یونینیں کمیونزم کی طاقت ہیں اور اس طرح طبقاتی جنگ پھیلتی بڑھتی ہے مگر ہستادروت ایک ایسی مزدور تنظیم ہے جو کمیونزم کی موت ہے! ہستادروت کے سب سے بڑے اور زیادہ بکنے والے اخبار کا موٹو "آزادیٔ خیال و اتحادِ عمل" ہے۔ اس طرح یہ تنظیم مغربی ملکوں کی مزدور تحریکوں سے بھی مختلف ہے ہستادروت اپنے مقصد و مدعا کے تحت اپنی ذمہ داری بڑھانے سے گھبراتا نہیں، اسی طرح وہ اپنے ممبر بڑھانے میں بھی حوصلہ مند ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ "تمام لوگ اپنی محنت کی کمائی سے پورا فائدہ اٹھائیں

اور کوئی شخص دوسرے کی محنت سے فایدہ اُٹھانے نہ پائے۔"

اسی لئے ہستادروت کی ممبری سب کے لئے کُھلی ہوئی ہے۔ ہات پاؤں کے مزدور، پولس مین، کسان، کلارک، ڈاکٹر، وکیل اور صناع سب اس کے ممبر ہیں اور ہو سکتے ہیں۔ البتہ جو کسان مزدور لگا کر کاشت کرتا ہے وہ اس کا ممبر نہیں بن سکتا۔

یہ ادارہ ۱۹۲۰ء میں قایم ہوا اسوقت اس کے ممبر ساڑھے چار ہزار سے بھی کم تھے مگر بڑھتے بڑھتے آج پونے دو لاکھ سے کچھ زیادہ ہیں۔ پیشے کے لحاظ سے اس کے ممبروں کے اعداد شمار یہ ہیں:۔

| | | |
|---|---|---|
| اپنی زمین پر کاشت کرنے والے | ۲۴ | فیصدی |
| کھیت مزدور | ۳ | " |
| ٹیچر، ڈاکٹر، وکیل وغیرہ | ۶ | " |
| پولس مین | ۲ | " |

یہ ایسے مختلف و متضاد پیشے کے لوگوں کا اجتماع ہے کہ اس کو نہ پرولتاریہ جماعت کہا جاسکتا ہے نہ درمیانی طبقے کا ادارہ۔ وہ ان دونوں کا مجموعہ ہے۔ الغرض ہستادروت سب کچھ ہے بینکر ہے، سلیس مین ہے، اکسپورٹر وامپورٹر ہے، تھوک فروش، خردہ فروش ہے، سرمایہ دار و مزدور ہے، اس کی حرکت و عمل کا دایرہ سر چکرا دیتا ہے اور اس کی طاقت اور شوکت کو دیکھ کر انسان حیران رہجاتا ہے۔

فلسطین میں حالات کچھ ایسے عجیب و غریب تھے کہ ہستادروت کے وجود میں آئے بغیر کام بھی نہ چلتا۔ یہی وجہ ہے کہ مزدور تنظیم ہونے کے باوجود ہستادروت دُنیا کے اور تمام مزدور اداروں سے مختلف ہے اس تنظیم کا کام مزدوروں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر دینا ہی نہ تھا، اس کا مقصد یہودی شخصیت کو نئے سانچے میں ڈھالنا بھی تھا۔ یہودیوں میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھا جو دو ہزار سال کی آوارہ گردی میں وہ کھو چکے تھے۔ ہستادروت کے ساتھ دوسرے یہودی اداروں نے بھی ہاتھ بٹایا۔ اس ادارے کے ایک ذمہ دار آدمی سے میں نے سوال کیا کہ "کیا وہ ایک فقرے میں ہستادروت کے مقاصد بیان کر سکتا ہے" تو اس نے اقرار کیا اور بتایا:۔

یہودیوں میں فلسطینیت Palestinisation پیدا کرنا۔

اس کا یہ لفظ میرے لئے ویسا ہی ناقابل فہم تھا جیسا لفظ ہستادروت۔ میرے لئے یہ اصلاح JUDISM اور ZIONISM سے زیادہ دلچسپ تھی۔

فلسطین میں متعدد یہودی ادارے کام کر رہے ہیں جن کا مقصد و مدعا ایک نئی قومی تعمیر ہے ہستادروت

بھی اسی مقصد کے لئے وقف ہے، مگر اس کا دائرۂ عمل وسیع ہے اس کے کارگزاروں نے سمجھ لیا ہے کہ مختلف ملکوں کے یہودیوں کو فلسطین میں پناہ دینا اور بسا دینا ناکافی ہوگا بلکہ خطرناک بھی ہوگا! یہ نیا یہودی سماج اگر درمیانی طبقے کے لوگوں سے بنتا ہے جس میں دوکاندار، وکیل اور دوسرے پیشوں کے آدمی ہوں تو یہودی وطن (HOMELAND) کا تعین ہوگا۔ ہستادروت اس لئے یہودی قوم کے اندر سے GHETTO ذہنیت کو فنا کر دینا چاہتا ہے، اس سماجی تنفر اور گھمنڈ کو مٹا دینا چاہتا ہے جو مختلف ملکوں کے یہودیوں میں سرایت کر چکا ہے۔ اس کا منشا و مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے اندر فطرت اور آراضی سے وہی لگن پیدا ہو جائے جو ان کے آباء و اجداد میں اسوقت تک پائی جاتی تھی جب فلسطین کے تاکستان آباد تھے اور زراعت شاداب تھی۔ آر ڈن، ڈیوڈ، گارڈن یہودی احیائے ثانی کا بڑا مبلغ تھا، لکھتا ہے :-

"وہ قوم جو فطری یعنے خود شعوری، خود مکتفی زندگی کے علاوہ کسی دوسرے قسم کی زندگی کی عادی ہو چکی ہے، ایسی قوم کبھی جفاکش نہیں بن سکتی تاوقتیکہ وہ اپنے ارادے اور عزم کو اسی مقصد کے لئے وقف نہ کر دے! محنت و مشقت محض سبب نہیں ہے جو انسان اور زمین کے درمیان رابطہ اور حق قایم کرتا ہے بلکہ وہ سب سے بڑی قوت ہے جو ایک تمدن ڈھالنے کے لئے درکار ہوتی ہے، محنت انسانی مستقبل کے لئے بد ترین تصور اور عقیدہ ہے، ایسی عینیت ہے جیسے آفتاب کی معالج نوعیت!"

فلسطین کے مہاجر یہودی جس ملک کے بھی ہوں، جسمانی مشقت کو سماجی کمتری کی دلیل سمجھتے تھے، محنت کا لفظ سماجی تحقیر کا مفہوم ادا کرتا تھا۔ اس لئے ان کو محنت و مشقت کا اعزاز و مرتبہ سمجھانے کے لئے کڑی تعلیم کی ضرورت تھی۔ کتاب و قلم ہی تنہا تہذیب و تمدن کی علامت نہیں، بلکہ کدال، ہتوڑا، پھاوڑا اور ہل بھی اسی طرح تہذیب و تمدن کے نشانات ہیں۔ یہ سارے مہاجر یہودی اگر دوکاندار، ڈاکٹر اور وکیل بن گئے اور کچھ زمیندار پیدا ہو گئے تو یہودی وطن کا کوئی مستقبل نہ ہوگا۔ ہستادروت زمینداری کے ادارے کو سامنت شاہی کی علامت سمجھتا اور اس سے سخت بیزار ہے۔ وہ سستے عرب مزدوروں پر یہودی کاشت کو منحصر کرنے کے سخت خلاف ہے اس کا مقصود ہے کہ یہودی اپنی زمینوں پر خود کاشت کریں۔ یہودی دوکاندار یہودی وکیل، یہودی پروفیسر، یہودی ڈاکٹر، یہودی کارخانہ دار، یہودی ماں باپ سب محنت پسند بنجائیں وہ فلسطین کو صناع و سائنسداں تاجر و مل مالک، کا ملک نہیں بلکہ مستریوں، مچھیروں، کسانوں، مزدوروں اور بوجھ اٹھانے والوں اور انیٹیں تھوپنے والوں کا ملک بنانا چاہتا ہے۔ لگاؤ کے ساتھ زمین پر محنت

کرکے اور ہرا گئے اور پکنے والی چیز سے محبت کرکے اسے ایسا مقدس و معزز بنا دیا جائے جیسی وہ عہدِ قدیم میں تھی۔ ہستادروت جنٹلمین کسان پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ مسکین اور ادنیٰ کسان بنانا چاہتا ہے اور یہ کوئی انجیل کا الہام نہیں بلکہ وقت کی وہ فوری ضرورت ہے جو انجیل کے الفاظ کو نیا مفہوم دیتی ہے۔

ان وجوہ پر ہستادروت سمجھتا ہے کہ اس کا فرض یہی نہیں ہے کہ مزدوروں کی معمولی اور مادی مانگوں کی حمایت کرکے انھیں پورا کرائے بلکہ یہ بھی ہے کہ غیر مشقتی یہودی کو محنت کش بنا دے۔ محنت سے محبت کرنا سکھائے۔ ہستادروت کا بہت سا لٹریچر جب میں نے مطالعہ کیا تو مجھ پر "محنت کی فتح" کا مفہوم واضح ہوا۔ اور میں سمجھا کہ "فلسطینیت" یہودیوں کے ذہن و مزاج کو کس طرح بدل رہی ہے۔

برطانیہ کی ابتدائی حکومت اٹھائیس سال فلسطین میں قایم رہی، اس مدت میں اگر وہ وہاں کی سماجی اصلاح مخلصانہ طور پر اتنی بھی کرنا چاہتی جتنی خود انگلینڈ میں کنسرویٹو حکومت نے کی تو ہستادروت ایسا زبردست ادارہ کبھی نہ بن سکتا جیسا کہ وہ آج ہے۔ برطانیہ کا سامراجی دماغ فلسطین میں بھی اتنا ہی غیر جواب دہ تھا جتنا دوسرے مقبوضات میں۔ سماجی رجحانات سے متعلق اس نے ہر جگہ دیسی حکمرانوں کو کم سے کم زحمت دی اور محنت کش عوام کی کم سے کم مدد کی ہے۔ فلسطین میں انتدابی حکومت نے جو "لیبرلا" بنایا وہ کسی ایسے تحفظی قانون سے تو بہت بہتر تھا جس سے عرب مزدور واقف تھے مگر اس سے بدرجہا ادنیٰ تھا جو کنسرویٹو حکومت خود انگلستان میں جاری کر سکی تھی۔ اس حکومت نے ۱۹۲۵ء میں یہ حکم تو بلا تامل جاری کر دیا کہ دیا سلائی بنانے میں سفید فاسفورس استعمال نہ کیا جائے مگر عرب لوگ اپنی کم عمر بچیوں کو ادنیٰ قسم کی خدمت پر نوکر کرنے کے جو معاہدے کرکے کچھ رقم وصول کر لیا کرتے تھے اس رواج کو موقوف نہ کیا۔ بڑی اصلاح یہ کی تھی کہ سال بھر سے زیادہ کا معاہدہ غیر قانونی ہوگا۔

ہستادروت نے اگر مزدور کے حقوق کی حفاظت کے لئے جد و جہد نہ کی ہوتی تو فلسطین ہمیشہ سستی مزدوری کی منڈی بنا رہتا۔ اس نے ایک طرف مزدور کے حقوق قایم کرائے اور دوسری طرف مہاجر مزدوروں کو محنت پسند بنایا۔ اس طرح اس نے وہ ذمہ داریاں اپنے سر لے لیں جو حکومتوں کو لینا چاہئے تھیں اور فلسطین کی انتدابی حکومت اسے پورا نہیں کر رہی تھی۔ مزدور کو پند و نصیحت کرنا بے نتیجہ ہے۔ اگر اسے یقین نہ دلایا جائے کہ اس کی محنت کا مناسب معاوضہ بھی ملے گا۔ اس نظریہ کے تحت ہستادروت نے رفاہ و اصلاح کا ایک ایسا پروگرام بنایا جو مغربی ملکوں میں بھی جاری نہ کیا جا سکا تھا۔ ہستادروت اپنے تمام مزدوروں کی جان، تندرستی، حادثہ، بیماری، ضعیفی اور بے روزگاری کا بیمہ کرتی ہے اور بیواؤں، یتیموں کو پنشنیں بھی دیتی ہے۔ زچہ کی حفاظت اور بچے کی خبر گیری اس بیمے کا خاص پہلو ہے۔ اس کا سب سے

عظیم الشان کام "بیمار فنڈ" ہے، جس کی شاخیں اور ادارے سارے فلسطین میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں جہاں یہودی کاشت کی نوآبادی ہے وہاں ہستادروت کا طبی امداد کا انتظام بھی ضرور ہے اس نے جو ادارے قایم کئے ہیں، ان کی تعداد ذیل میں درج ہے:-

| | |
|---|---|
| اسپتال | ۶ |
| بعد صحت آرامگاہیں | ۴ |
| مرکزی دواخانے | ۸ |
| دیہاتی ڈسپنسریاں | ۳۱۵ |
| ایکسرے انسٹی ٹیوٹ | ۷ |
| مرکزی فارماسیوٹیکل ڈپو | ۱ |
| فارمیسیاں | ۱۶۱ |
| دانت کے کلینک | ۲۷ |
| الکٹروتھیراپی انسٹی ٹیوٹ | ۳۰ |
| بچوں کی خبرگیری کا سینٹر ڈپارٹمنٹ آف ہائی جین | ۱ |

ان تمام ممبروں کے علاوہ ہستادروت غیر ممبر عربوں کو بھی طبی امداد پہونچاتا ہے اور زچہ کی خبرگیری کا خاص انتظام ہے۔ اس کام کے لئے اس نے تمام کارخانہ داروں سے وہ جتنی مزدوری سال بھر میں ادا کرتے تھے اس کا تین فیصدی وصول کیا اور ۱۹۳۲ء میں اپنے ممبروں سے سات بلکہ گیارہ فیصدی تک وصول کیا اور یہ سارے کام جاری کئے۔ اس فنڈ میں انتدابی حکومت اور دوسرے یہودی اداروں نے بھی چندہ دیا۔ بعض طبی اسکیموں میں عرب مزدور بھی شامل ہیں۔ عرب مزدوروں کو ہستادروت پوری طرح شامل کر لیتا مگر باہمی مفاد بڑا مانع تھا۔ اس لئے اس نے فلسطین لیبر لیگ قایم کرائی جس میں دونوں قوموں کے مزدور اپنی آزاد مزدور جماعتوں کو خودمختار رکھتے ہوئے بعض مفاد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو سکیں۔ اس لیگ کا کام عربی و عبرانی دونوں زبانوں میں ہو سکتا تھا۔ اس لیگ کے پانچ ہزار سے زیادہ ممبر نہ بنے اور سیاسی نزاکتوں کی بنا پر اپنا مقصد حاصل نہ کر سکی۔

دُنیا بھر میں کوئی انسان طبی امداد سے اتنا محروم نہیں جتنا وہ عرب کسان جو شہروں سے فاصلے پر آباد ہے۔ ہستادروت کی طبی تنظیم ان عرب کسانوں کی خدمت کرتی ہے۔ دو ہزار پانچسو سے کچھ زیادہ ڈاکٹر نوکر ہیں۔ ان میں دو سو سے اوپر عرب ہیں اور سوا سو غیر عرب عیسائی باقی سب یہودی ہیں۔ لیبر لیگ

اپنے عرب ممبروں کو طبی امداد پہونچاتی ہے۔ وسیع پیمانے پر طبی امداد کا انتظام ہستادروت کی حرکت و عمل کا صرف ایک پہلو ہے، ورنہ اس کی خدمات مختلف نوعیت کی ہیں۔ جسمانی اور کلچری ترقی و بہبود کی خاطر متعدد تجارتی ادارے قایم ہیں۔ تعلیم گاہوں کے علاوہ کھیل کے میدان تھیٹر اور اخبار اور رسالے نکل رہے ہیں۔

ہستادروت کی امداد نہ ہوتی تو عواط برنیر آباد نہ ہو سکتا اور آباد بھی ہو جاتا تو اتنا خوشحال و کامیاب نہ ہوتا۔

ہستادروت کے جہاجنی ادارے تھوک اور خوردہ فروشی کی کوآپریٹو سوسائٹیاں اور فیکٹریاں سب نوآبادکاروں کی بحالی و ترقی کے لئے اور ہر وقت ان کی خدمت کے لئے آمادہ ہیں۔ فلسطینی ساخت کے اوزار، آلات، درآمد کی ہوئی مشینیں، فنی جمایت، ہوشیار مستری، کاشت کے ماہر، اور دوسری بہت سی چیزیں نوآبادکاروں کی خدمت کے لئے اسی طرح قابل حصول ہیں جس طرح طبی امداد۔ فلسطین میں دو سو کے قریب امداد باہمی اور چھوٹے کاشتکاری کے گاؤں ایسے ہیں جو ہستادروت کی امداد کے بغیر آباد نہ ہو سکتے تھے۔

یہودی قوم میں مخصوص ذہن و دماغ کا کاشتکار طبقہ پیدا کر دینا اسی عظیم الشان ادارے کا کام تھا۔ اس کے تمام کام پہلے سے سوچے سمجھے پلان کے مطابق انجام پاتے ہیں اور ان اسکیموں اور پلانوں کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ کاشتکار کاشت کو کامیاب بنانے کی فکر کے سوا ہر فکر سے آزاد ہو۔ چنانچہ اس ادارے کی مدد اور ہدایت کے بموجب نوجوان یہود مرد اور عورتوں کی ایک جماعت بحر مردہ کے ساحل پر پہونچی جہاں صدیوں سے کسی قسم کی روئیدگی کا وجود نہ تھا کیونکہ زمین میں تیزابی مادہ تھا، ان نوجوانوں نے بالآخر اس زمین کو کارآمد بنا لیا اور وہاں بیت حاردہ کے نام سے ایک خوشحال گاؤں آباد ہو گیا۔ لیکن ۱۹۴۸ء کی جنگ میں وہ گاؤں عرب فوجوں نے پامال کر دیا۔

یہ ادارہ مسلسل و متواتر نئی زمینیں دستیاب کرنے کی جستجو میں رہتا ہے۔ ۱۹۴۳ء میں اسنے نغیف کے علاقہ پر توجہ کی۔ یہ علاقہ جنوبی فلسطین میں کوئی تیس لاکھ ایکڑ زمین کا ایک مثلث ٹکڑا ہے۔ پانی کی قلت تھی اور روئیدگی کا صرف ایک کنارے پر وجود تھا وہاں بدوی لوگ سیاہ ڈیرے جمائے اپنے گلّوں کو چراتے تھے اور اگر پانی برس جاتا تو گڑھوں میں پانی جمع کر کے کچھ کاشت بھی کر لیتے تھے۔ حالانکہ کسی وقت یہ علاقہ ایک تمدن کا مرکز رہ چکا تھا۔ اس علاقے کو شاداب بنانے کے لئے ہستادروت نے تین مہمیں جدا جدا روانہ کیں تاکہ زمین، آب و ہوا اور پانی کی تلاش کر کے رپورٹ دیں۔ ۱۹۴۶ء تک اس علاقہ میں چودہ گاؤں آباد ہو گئے۔

الکیس اور آباد کرنے کی اسکیم تھی۔ سنہ ۴۸ء میں یہ علاقہ جنگ کا میدان بنا رہا۔

کاشت کی ترقی کے ساتھ ہستادروت نے گھریلو صنعتوں کو بڑھانے میں بھی بہت بڑا کام کیا ہے۔ مشکل سے کوئی کاشتکار آبادی ایسی ہوگی جہاں اچھے بڑے پیمانے پر گھریلو صنعتیں نہ چل رہی ہوں۔

امداد باہمی کے اصول پر پورے فلسطین میں عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہستادروت نے کسی سیاسی نظریے کو قبول نہیں کیا ہے۔ اور یہی بات اس کی طاقت و اثر کا راز ہے۔ من حیث الجماعت ہستادروت کا رجحان سوشلسٹ ہے لیکن وہ کوئی سیاسی پارٹی نہیں بنا ہے۔ سنہ ۴۵ء میں اس کی چھٹی جنرل کنونشن ہوئی تو فلسطین کی پچیس سیاسی پارٹیوں میں سے دس پارٹیوں کے لوگ اس کنونشن میں شریک تھے۔ ہرچند ہستادروت یا لیبر پارٹی اس ادارے میں اکثریت رکھتی ہے مگر ادارے کے کاموں میں سیاسی عقاید کا اختلاف کبھی حائل نہیں ہوا۔ یہ ادارہ سوشل ڈیماکریٹ سے بہت قریب ہے۔

روس کی حالیہ پالیسی نے کمیونسٹوں کو فلسطین میں نامقبول بنا دیا ہے، لیکن سخت اختلاف کے باوجود وہاں باہمی عناد نہیں پایا جاتا۔

ہستادروت کی بڑی خصوصیت اس کی کاروباری ذہنیت رکھنا اور اسکا عملی ہونا ہے۔ ممبروں کی تعداد بہت زیادہ ہونے کی وجہ سے اس کی مالی طاقت اور سماجی وقار اتنا بڑھا ہوا ہے کہ انتدابی حکومت کے زمانہ میں اسے "ریاست کے اندر ریاست" سے تعبیر کیا جاتا تھا، اور اس وقت یہ بات غلط بھی نہ تھی اس لئے کہ ہستادروت بہت سے ایسے کام کرتا ہے جو حکومت کو کرنے چاہئیں۔ اب چونکہ اسرائیلی ریاست قایم ہوگئی ہے۔ اس لئے ہستادروت اب بھی ریاست کے اندر ایک ریاست ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ مستقبل کرے گا۔ اور وہ اس لئے کہ خود اسرائیل کے مستقبل کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا، ایک چھوٹی سی ریاست کے اندر پچیس مختلف عقاید کی سیاسی پارٹیاں کوئی نیک شگون نہیں کہا جا سکتا اسرائیل کے انتہا پسند جو انتدابی زمانے میں دہشت انگیزی پھیلاتے رہے، اب اکھنڈ فلسطین چاہتے ہیں۔ اور ان کی طاقت و اثر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میرے خیال کے مطابق یہ جماعت یہودی قومی اتحاد کے لئے خطرہ ہے۔ کیونکہ اکھنڈ فلسطین کے تصور میں اگر اس جماعت کو کامیابی نہیں ہوئی تو وہ خود اسرائیل کے خلاف بھی ہو سکتی ہے۔ یہ ایک اہم سوال ہے جو اسرائیل کے سر پر منڈلا رہا ہے۔ میں یہ بھی سمجھتا ہوں اس ذیل میں ہستادروت کا اثر و رسوخ ہی توازن کو برقرار رکھ سکتا ہے۔

---

# سولھواں باب

## (بیداری یا تباہی)

بالآخر میں واپس سوئٹزرلینڈ پہونچ گیا۔ جنیوا کا موسم گندہ تھا مگر اس کی ستھرائی اور صفائی چمکتی معلوم ہوتی تھی، مشرق وسطیٰ کے شہروں کے مقابلہ میں جنیوا ایک نئی چیز معلوم ہو رہا تھا۔ اصل میں یہاں تمدن اپنی ابتدائی منزلیں طے کر رہا ہے اور اینٹ پر اینٹ چن کر ایک ذیشان عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ جنیوا میں قاہرہ کی سی شان و شوکت اور افلاس و امراض کی انتہا دونوں مفقود ہیں۔

خیالات کو ایک مرکز پر لانے کے لئے جنیوا بہت مناسب مقام ہے۔ میں نے اپنی یادداشتیں نکالیں اور وہ سب کتابیں بھی جو میں نے دوران سیاحت میں خریدی تھیں اور وہ لٹریچر بھی جو مجھے وزارت خارجہ کے دفتروں سے ملا تھا۔ میں ان سب پر غور کرنے لگا۔

جسوقت میں اپنی نوٹ بک کو پڑھ رہا تھا تو ان میں لطف و رافت، ترحم و ہمدردی کی تمام باتیں ڈپلومیٹ لوگوں کی منھ کی نہیں بلکہ مشنری پادریوں کی کہی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر ولیم لام اور ڈاکٹر ولیم شارب سے میری ملاقاتیں بھول جانے والی چیز نہ تھیں، یہ دونوں تصنع سے پاک اور اپنے حلقۂ عمل کی ممتاز ہستیاں تھیں، ایران کے لوگوں سے ان کے تعلقات جس نوعیت کے تھے وہ بلاشبہ بڑے محرک و سبق آموز تھے۔ ڈپلومیسی اور پاور پالیٹکس سے یہ دونوں انسان بہت اونچے اور ارفع تھے۔ ان کا کام نوع انسان کی خدمت ہو ان پادریوں نے ایران میں سوال انسانیت کی اہمیت کا جیسا اندازہ کیا ہے کسی ڈپلومیٹ یا سائنس کے ماہر نے نہیں کیا ہے۔ ان پادریوں نے کوئی حل تو پیش نہیں کیا لیکن بہتری کی امید ضرور ظاہر کی ہے۔ یہ بہتری کس طرف سے آئے گی؟ یہ نہ ان کو معلوم ہے نہ کسی اور کو۔

جو لٹریچر میں نے دوران سیاحت میں خریدا اس میں لاؤڈر ملک کی کتاب PELASINE:LANDOFPROMISE بھی تھی۔ اس میں بہت سی ایسی باتیں درج ہیں جو میرے

مشاہدے میں نہیں آئیں، یارہ گئیں، لیکن اس کتاب کے اس حصّہ کو میں کبھی نظرانداز نہیں کرسکتا جس نے مجھ پر یہ حقیقت ظاہر کی کہ:-

"روبہ انحطاط مشرق ادنیٰ کی اصلاح و ترقی کا راستہ یہودیوں نے فلسطین میں اپنی نوآبادیوں سے بتا دیا ہے"

اس اقتباس میں مشرق ادنیٰ کا مطلب مشرق وسطیٰ ہے۔ ایران، عراق، عرب، شام، لبنان، ماورائے اردن سینا اور مصر وغیرہ جن کی حالت تقریباً ایک سی ہے ---------- اور جن کی بربادی کے متعلق ولیم دوگت کے یہ الفاظ بڑی اہمیت رکھتے ہیں جو اس نے زمینداروں کے ذکر میں لکھے ہیں کہ:

"ہر سال جسم آراضی سے ایک پونڈ گوشت کاٹتے رہنے نے لاکھوں ایکڑ زمین (اور انسانوں) کو برباد کر دیا ہے"

اسی طرح چارلس عیسوی کی یہ جملے:

"کسی طبقے نے اپنی ہستی کے جواز کا اتنا کم ثبوت نہیں دیا جتنا مصری زمیندار نے جس کو تمام مراعات حاصل ہیں مگر حکمراں طبقے کی خوبی ان کے اندر ایک بھی نہیں!"

مس ڈورین وارینر نے اپنی کتاب "مشرق وسطیٰ کی آراضی اور افلاس" میں لکھا ہے کہ:-

"فاقوں سے واسطہ، اموات میں زیادتی، زمین کی بربادی، اقتصادی لوٹ کھسوٹ، یہ ہے مشرق وسطیٰ کی دیہاتی زندگی کا خاکہ! یورپ بھر میں اس شدید افلاس کی مثال کہ صاف پانی بھی میسر نہ آتا ہو، کبھی اور کہیں نہیں ملتی۔ ایک انسان ان گندگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا جو ایک ہی مکان میں انسان اور مویشی کے ساتھ رہنے سے پیدا ہوسکتی ہے"

ایرانی عمال و حکام کی زبان سے میں نے یہ جملہ اکثر سنا "کاش ہمیں پانی میسر ہوتا!" لیکن ایران میں پانی کی کمی نہیں۔ زمین کے نیچے اتنا پانی ہے کہ ایران کو اتنی ضرورت بھی نہیں۔ کاش ایرانی پانی نکالنے پر توجہ کرتے! ڈاکٹر لائل بیڈل نے ایک ایرانی گاؤں میں کنواں کھود کر ثابت کر دیا کہ پانی کی کمی نہیں ہے۔ اس کنویں سے فی گھنٹہ پندرہ بیس ہزار گیلن پانی اُبلتا ہوا نکلا۔ اسی طرح شیراز میں ایک انگریز انجینیر نے پینے کے پانی کے لئے کنواں کھودا اور معلوم ہوا کہ پانی بے انتہا ہے۔ پھر بارش کی طغیانیاں ملک کی بربادی کا سبب بنتی ہیں حالانکہ یہی پانی اگر جمع کیا جائے تو دولت پیدا کرسکتا ہے۔ صرف اس پانی کا ذخیرہ کرنے میں کوئی خاص زحمت نہیں اُٹھانا پڑے گی اور بٹائی پر کاشت کرنے والے کسانوں کے ساڑھے بارہ لاکھ کنبے معاش پاسکیں گے۔ ایران اپنے موجودہ ذرائع سے اپنی کاشت کو تگنا کرسکتا ہے، ضرورت، ڈھنگ، طریقے

بدلنے کی ہے۔ جن بیماریوں کو آسانی سے دفع کیا جا سکتا ہے ان سے بیس لاکھ بھیڑیں ہر سال مرجاتی ہیں۔ حشرات الارض کھیتی کا تقریباً تین کروڑ ڈالر سالانہ کا نقصان کر دیتے ہیں۔ حالانکہ پانچ ڈالر فی کس سالانہ کے خرچ سے تین سال میں ملیریا کو بالکل ختم کیا جا سکتا ہے، لیکن کوئی پروا نہیں کرتا۔

حیرتناک ماجرا ہے کہ جو ملک تیل کی پیداوار میں چوتھے نمبر پر ہو وہ قیمتی جنگل اور اس سے زیادہ قیمتی کھاد کو ایندھن کی طرح جلا ڈالے! ایسی قوم کے متعلق کوئی کیا کہہ سکتا ہے!

مصر "باغ عالم" کہلاتا ہے مگر تین چوتھائی آبادی جو دیہات میں رہتی ہے آنکھوں کے مرض کا اور خارش و داد کا شکار ہے۔

شام کی تیس لاکھ کی مردم شماری میں دو تہائی کاشت کرتی ہے مگر قابل زراعت آراضی کا ساٹھ فیصدی رقبہ ایسے زمینداروں کی ملکیت ہے جو دیہات کو جھانک کر بھی نہیں دیکھتے۔ شام میں ساڑھے بارہ لاکھ ایکڑ پر کاشت کی جا سکتی ہے مگر زیر کاشت آراضی اس کا تیسرا حصہ ہے۔ کاشتکار بآسانی بے دخل کیا جا سکتا ہے، اس لئے وہ زمین پر محنت کیوں کرے؟

عراق پینتالیس لاکھ انسانوں کا ملک ہے۔ وہاں بھی قابل کاشت زمین پر صرف بیس فیصدی زراعت ہوتی ہے۔ برطانوی سائنسدانوں نے عراق کی کاشت اور آبرسانی کو کافی ترقی دی ہے لیکن کاشت چونکہ بٹائی پر ہوتی ہے اس لئے کوئی معقول فایدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔

سو سال کے قریب ہوئے جب روسی طنز نگار سالتی کوف شچیدرین نے روسی کسان کی برباد حالت پر غصہ کرتے ہوئے لکھا تھا:-

> "ہمارے کسان چمڑے کے بدلے لکڑی کے جوتے کیوں پہنتے ہیں؟ گوشت کی غذا انکے لئے ناممکن کیوں ہے؟ انھیں مکھن یا چربی کیوں میسر نہیں؟ وہ تقدیر پرست کیوں ہیں؟ اور ان کا ضمیر کیوں مردہ ہو گیا ہے؟ وہ کیوں کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے اور کیوں مکھیوں کی طرح مرجاتے ہیں؟"

یہی سوال عرب ملکوں میں وہاں کے فلاح کے متعلق دہرائے جا سکتے ہیں۔ روس میں زرعی غلامی رائج رہی تو روس کو اس کی قیمت بدترین خونیں انقلاب سے دینا پڑی۔ مشرق وسطیٰ کے ملکوں کی موجودہ حالت دیکھنے اور سمجھنے والا بھی کچھ اس طرح کا قیاس قایم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

میرے سامنے مشرق وسطیٰ کے ملکوں کے قوم پرست نہیں بلکہ وہاں کے فلاح ہیں۔ اس کی تندرستی کی بحالی سب سے مقدم ہے، کیونکہ وہ موثر طریق پر فوج میں خدمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔ ۱۹۴۸ء کے

فلسطینی معرکے میں عرب سپاہی بہترین اسلحہ کے باوجود نکما ثابت ہوا، حالانکہ برطانوی کمانڈر کا دعویٰ تھا کہ عرب فوجیں دس دن کے اندر پورے فلسطین کو روند ڈالیں گی۔

ان ملکوں میں فوجی طاقت اس لئے مفقود ہے کہ تندرستی غائب ہے، انسانوں کا ہجم غفیر ادنیٰ قسم کی خوشی سے بھی محروم ہے۔

ان ملکوں کا فلاح کاشتکار نہیں بلکہ کھیت مزدور ہے کیونکہ زمین اس کی اپنی نہیں ہے۔ اور بے زمین والا کسان ایسا ہی ہے جیسے بغیر پانی کا پودا وہ عناصر فطرت کے قہر اور انسان کی حرص و طمع کا شکار ہے۔ وہ نہ ڈیماکریٹ ہے نہ سٹیزن، قانون بنانے میں اسے کوئی دخل نہیں مگر اس کی تعمیل پر مجبور ہے ............ وہ نہ خریدار ہے نہ تعمیر کرانے والا، کیونکہ اس کی کوئی قوت خریداری نہیں ہے۔ اسی لئے وہ ملک کی صنعت و تجارت میں کسی قسم کی مدد نہیں پہونچا سکتا اور اس طرح قوم و ملک کے اقتصاد اور کلچر پر بار ہے۔ اس کی زندگی ایسی باتوں سے خالی ہے جو ولولہ پیدا کر سکیں جو اس کی قابلیتوں کو بر سر عمل لا سکیں۔ فلاح نہ تو زندگی میں اپنے اولاد کو کچھ دے سکتا ہے اور نہ مرنے کے بعد کوئی ورثہ چھوڑتا ہے۔ سید ضیاء الدین سابق وزیر اعظم ایران کے الفاظ ہیں:۔

"بھوکے انسان کا نہ خدا ہے نہ وطن!" ان ملکوں میں عروج قوم پرستی نے وہاں کے فلاح کو کچھ نہیں دیا روٹی کی بھوک آراضی کی بھوک کا نتیجہ ہے اور اس بھوک نے دنیا میں خونیں انقلاب کر دئے ہیں۔ آئرلینڈ اور میکسیکو میں بار بار خون کی ندیاں بہی ہیں۔ چین آج بھی خون میں ڈوبا ہوا ہے۔ جنوبی امریکہ کے ملکوں میں آج کل بھی انقلاب برپا ہوتے رہتے ہیں، انقلاب ہوتا ہے، ڈکٹیٹری قایم ہوتی ہے پھر انقلاب ہوتا ہے۔ یہ سارے انقلاب صرف اس لئے ہیں کہ زمین کو جوتنے والا زمین کا خود مالک نہیں ہے۔ اور جب تک ایسا ہے، خون بہتا رہے گا۔ میرا عقیدہ ہے کہ زار روس اگر زرعی غلامی کو ختم کرنے کا حکم جاری کر دیتا تو روس میں بولشویک انقلاب ہرگز برپا نہ ہوتا۔

جان برائٹ ایک برطانوی لبرل نے سو سال پہلے لکھا تھا کہ:۔

> "قانون جب اپنا فرض ادا کرنے سے انکار کر دے، حکومت جب عوام کے حقوق ادا کرنے میں قاصر رہے، زمیندار جب آراضی کے چھوٹے ٹکڑوں پر کاشتکاروں میں ضد اور مقابلہ پیدا کر کے نفع اٹھائے، وہاں لوگ قانون سے سرگردانی کرنے لگتے ہیں، تہذیب و تمدن کے اصول ترک ہو جاتے ہیں اور فطری بلکہ انتقامی قانون کام کرنے لگتا ہے!"

۱۷۲۹ء میں جوناتھن سوئفٹ نے آئرلینڈ کے متعلق لکھا تھا:۔

"ایک تجویز یہ ہے کہ زمین کے مالک اپنے کاشتکاروں پر کم سے کم یہ رحم ضرور کریں کہ ان کے بچوں کو لے لیا کریں۔ ان بچوں کا گوشت دس شلنگ کو ضرور بک سکتا ہے، اس میں سے آٹھ شلنگ ماں کو دیدیا کریں تاکہ دوسرا بچہ ہونے تک وہ اس رقم سے اپنے آپ کو کام کے قابل رکھ سکے۔"

آج مشرق وسطیٰ کے زمیندار اُسوقت کے آئرش مالکان زمین سے بہتر نہیں ہیں -- امریکہ اور ڈنمارک وغیرہ کی ترقیاں جہاں زمین اسکے جوتنے بونے والے کو دیدی گئی ہے، اسی پالیسی کا نتیجہ ہیں، اور وہاں بعض خرابیاں اسی وجہ سے نہیں ہیں کہ کسان اپنی زمین کا مالک ہے۔ فلسطین کے یہودیوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ زمین خراب ہونے کے باوجود اور کسان کی کمزوری کے ہوتے ہوئے بھی ان دونوں میں نئی جان ڈالی جاسکتی ہے، اس میں شک نہیں کہ عرب فلاح کے مقابلہ میں یہودی کاشتکار کو صدہا قسم کی سہولتیں حاصل ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ کہ اسے کاشت کو کامیاب بنانے کے سوا کوئی کام نہ تھا، ان کو عرب فلاح کی سی مصیبتیں برداشت نہیں کرنا پڑیں، نہ اسے باہمی مجادلہ میں مبتلا ہونا پڑا نہ اپنے لیڈروں سے نئے طریقے اور اوزار استعمال کرنے کے لئے کشاکش کرنا پڑی۔ تاہم فلسطین کا یہودی اگر یہ سب کچھ نہ دکھاتا تو عرب وایرانی لیڈروں اور غیرملکی ڈپلومیٹ کو ایسے یہودی پیدا کرنا پڑتے تاکہ عربوں کو بتایا جاتا کہ "اپنی مدد آپ" کے معنی کیا ہوسکتے ہیں! یہود و عرب کی عداوت کیسی ہی شدید ہو، یہودی آبادکاروں کے کارنامے عرب کی نجات کا موجب بن سکتے ہیں۔

برٹش ڈپلومیسی نے مشرق وسطیٰ میں جس ناروا پالیسی پر عمل کیا وہ عربوں اور یہودیوں کی بدنصیبی تو تھی ہی، برطانیہ اور دنیا کی شومیٔ قسمت کا بھی ثبوت ہے۔ یہود و عرب آج ایک دوسرے کے دشمن ہیں، ان کو دوست بنانے کے لئے عقل سلیمانی درکار تھی مگر برطانیہ کے پورے ریکارڈ میں کسی ایک کوشش کا ثبوت بھی موجود نہیں ہے۔ ۱۹۳۸ء میں جب میونک کی شطرنج کھیلی جاچکی اور چیمبرلین نے "ہماری زندگیوں میں امن" کا اعلان کیا تو میں اور دوسرے صحافی جو اس وقت پراگ میں موجود تھے اس ڈپلومیسی کو مطلق نہ سمجھ سکے۔ لیکن جس پاور پالٹیکس نے برطانیہ کی فلسطینی پالیسی بنوائی وہ بھی میونک کی طرح کوتہ اندیشی کی پالیسی تھی ---- اسرائیل آج ایک خودمختار ریاست ہے، بیرونی دنیا کے اثرات اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کا فرض ہے کہ عرب دنیا کا اچھا پڑوسی بنے۔ اس یہودی ریاست کے سامنے اس سے زیادہ اہم اور تاریخی کام دوسرا نہیں ہوسکتا یہودی ریاست یہ نہیں کرتی ہے تو نہ وہ خود چین پائے گی نہ عرب دنیا کو چین ملے گا ---- اپنے وطن امریکہ واپس پہونچ کر میں نے وہ غیرمعمولی تابناکی اور فراوانی دیکھی جیسی کسی ملک میں نہ دیکھی تھی۔ باتیں اونچی آوازوں میں کی جارہی تھیں۔ زندگی کے ہر شعبے اور میدان میں ہمارے قومی لیڈر دنیا کی جانچ کر رہے تھے، سائنسداں اسے ایٹمی بحران بتاتے ہیں سوشل سائنس کے ماہر کہتے ہیں کہ انسانی علم میں بحران آیا ہوا ہے۔ اقتصاد کے ماہر اسے اقتصادی بحران کہہ رہے ہیں، علم النفس کے ماہر کہتے ہیں کہ ایک عالمگیر اعصابی اختلال ہے، سیاسی مدبر اسے روس کے حملہ سے تعبیر کرتے ہیں، کمیونسٹوں کا خیال ہے کہ انکے عقاید اور سرمایہ داری کے مابین ایک بین الاقوامی معرکہ ہے، فلسفی سمجھ رہے ہیں کہ کچھ نہیں بس خیال کے اندر بحران ہے، مذہبی پیشوا اُسے ایمانی بحران سمجھتے ہیں، مگر ارضیات کے سمجھنے والے زمین اور آبادی کا بحران مانتے ہیں۔

ان تمام آوازوں میں سے یہ آخری پکار میرے لئے کشش رکھتی ہے - فیرفیلڈ آسبورن مصنف OUR PLUNDERED PLANET اور ولیم ووگت ROAD TO SURVIVAL کی آوازوں نے مجھے بہت مسحور کیا - یہ اور ایسے دوسرے لوگ پاور پالیٹکس سے بہت بلند ہیں - وہ بتا رہے ہیں کہ اگر زمین کی گھٹتی ہوئی قوت کا علاج نہیں کیا گیا تو انسان کے مقدر پر مہر لگی سمجھو!

مغربی ملکوں کے کاشتکار نے ان "پیغمبروں" کی آواز پر دھیان دینا شروع کر دیا ہے، مگر فلسطین کو چھوڑ کر مشرق وسطیٰ کے تمام زمیندار اور لیڈر ہنوز خواب خرگوش میں ہیں - وہ نہیں جانتے کہ زمین کی نجات کسان کی مدد ہی سے ممکن ہے، اور کسان کی مدد اسی وقت حاصل ہوگی جب اس کا معیار زندگی اونچا ہوگا۔

باین ہمہ دُنیا کے سیاست داں اور مدبر "روسی حملے" کے خلاف جدوجہد کر رہے ہیں - کمیونزم کے پھیلاؤ کو روکنے کی تدبیروں میں لگے ہیں، ایشیا و افریقہ کی بغاوتوں پر دماغ سوزی کر رہے ہیں، تیل اور ہوائی اڈوں کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں، فوجی ماہر جنگ کے نقشوں پر جھکے ہوئے ہیں - طبقات الارض کے ماہر، اور انجنیر اور بنکر اپنے ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں تیل کے ذخیروں کا حساب لگا رہے ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن ایک غریب فلاح ہے جسے کوئی نہیں پوچھتا، گویا اس کا کوئی وجود ہی نہیں! حالانکہ یہ اٹھارھویں اُنیسویں صدی نہیں، بیسویں صدی ہے!، ہوا بازی اور ایٹمی توانائی کی صدی ہے! ہوائی جہاز ہی نہیں پرواز خیال کی صدی ہے! بغاوت کے خیالات کی پرواز کی صدی ہے! وہ نہیں دیکھتے کہ دُنیا کا کسان کسمسانے لگا ہے - حرکت میں آرہا ہے! وہ کارل مارکس کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن اس سے آراضی کی بات کی جائے تو فوراً سمجھ لیتا ہے - اسکو اگر کوئی صحیح حل نہیں بتایا گیا تو غلط حل کو قبول کرے گا - وہ ہر اس آدمی کی بات مان لے گا جو زمین دیدینے کا وعدہ کرے، کیونکہ زمین اس کی جان ہے - اس کی مدد کرنے کو مغربی طاقتیں کھڑی نہیں ہوتیں تو مشرقی کسان کی مدد کرنے کے چیلنج کو قبول نہیں کرتی تو کمیونزم کی فتح یقینی ہے، کل جو روس میں ہوا، آج جو چین میں ہو رہا ہے، وہی کل وسطی مشرق اور دوسرے ملکوں میں ہوگا۔

مغربی طاقتوں کا مشرقی ملکوں کو قرضے دینا ایسا ہی ہے جیسے سرطان والے رخسار پر غازہ ملا جائے، بیمار گالوں پر تندرستی کا غازہ نہیں چڑھ سکتا۔

دمشق، بیروت، بغداد، مکہ، طہران، قاہرہ اور ان کے ساتھ لندن و واشنگٹن بھی ایک پیغمبر کے انتظار میں ہیں جو سماجی مقصد و اصلاح کا جھنڈا لئے ہوئے عیسےٰ کی طرح کاشتکار کو صرف یہ کہکر ہوش میں لائے کہ:

"جاگ! جاگ!! اور طاقت کا مظاہرہ کر!"

---

# جنگِ عظیم کے بعد اسلامی سلطنتوں کا انقلاب

**تمہید** آپ نے مارس ہنڈس کی زبان سے ایران اور مشرقِ وسطیٰ کے بعض اسلامی ممالک کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی کی داستان سُن لی، جس سے ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اگر ان حکومتوں نے مزارعین کی حالت کو درست نہ کیا اور پیشہ وروں کو صنعت و حرفت کے صحیح راستہ پر ڈال کر، ان کے مطالبات کو پورا نہ کیا تو ایک نہ ایک دن کسانوں اور مزدوروں کے جذبات کا ناقابلِ ضبط ہو جانا ضروری ہے۔ ہنڈس اسے "مستقبل کی تلاش" کہتا ہے، لیکن میرے نزدیک اسے "مستقبل کا سایہ" کہنا زیادہ موزوں ہوگا، جو مادی حقیقت میں تبدیل ہونے کے لئے نہایت تیزی سے آگے بڑھتا آرہا ہے۔

اسلامی ممالک میں جو ذہنی انقلاب اس وقت پایا جاتا ہے، وہ آج کی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پہلی جنگ عظیم کے وقت ہی پڑ گئی تھی لیکن بدقسمتی سے اس پر آج تک کوئی عمارت قایم نہیں کی گئی۔ پھر ہو سکتا ہے کہ کچھ زمانہ اور اسی طرح گزر جائے، لیکن یہ یقین کرنا کہ ہمیشہ یہی حالت رہے گی درست نہیں۔ کوہ آتش فشاں بعض اوقات بغیر دھواں دئے ہوئے بھی پھوٹ پڑتا ہے اور یہاں تو دھواں بھی عرصہ سے اٹھ رہا ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ کس وقت اُبل پڑے۔

اس کتاب کے تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں باب خصوصیت کے ساتھ مطالعہ کے قابل ہیں، کیونکہ وہ نہ صرف عربوں بلکہ تمام مسلمانوں کے لئے بڑا زبردست درسِ عمل اپنے اندر رکھتے ہیں، آج فلسطین میں عربوں اور یہودیوں کے اختلاف نے جو صورت اختیار کر لی ہے اس سے ہر شخص باخبر ہے اور عربوں کے ان جذبات سے ہر مسلمان کو ہمدردی ہے کہ ارضِ فلسطین سے انھیں محروم نہ کیا جائے لیکن سوال یہ ہو کہ کیا عربوں کی یہ خواہش اور مسلمانوں کی یہ تمنا پوری ہو سکتی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے کہ فلسطین میں یہودیوں کو بسانے کے ذمہ دار برطانیہ و امریکہ ہیں، تو یہ بھی غلط نہیں کہ برطانیہ و امریکہ کا یہ طرزِ عمل کسی مذہبی یا انسانی ہمدردی کی بنا پر نہ تھا بلکہ نتیجہ تھا یہودیوں کے علمی و اقتصادی اقتدار کا جو جنگ کے دوران ہی میں قایم ہو چکا تھا اور جس نے بعد از جنگ ایسی جذباتی رو کی شکل اختیار کر لی کہ اس کا مقابلہ امریکہ و برطانیہ کے بس کی بات بھی نہ تھی۔

عربوں کو بہت پہلے سے معلوم تھا کہ یہودی ارضِ فلسطین کو اپنا قدیم وطن سمجھ کر وہاں آباد ہونا چاہتے ہیں، لیکن

انھوں نے اس سیلاب کے روکنے کی جو تدابیر اختیار کیں، وہ یکسر سفیہانہ اور غیر فطری تھیں، سفیہانہ اس لئے کہ انھوں نے امریکہ و برطانیہ پر اعتماد کیا اور غیر فطری اس لئے کہ وہ خود اپنے آپ کو اس سیلاب کے روکنے کا اہل بنا سکے یہودی ارض فلسطین میں اس شان کے ساتھ داخل ہوئے کہ ان کے پاس علم تھا، دولت تھی، غیر معمولی فراست و دانائی تھی، فوج تھی، اسلحہ تھے اور اسی کے ساتھ عزم راسخ — اس کا مقابلہ میں عربوں کے پاس کیا تھا؟ جہل، افلاس، فقر و فاقہ، تشتت و انتشار، خود غرضی، کم ہمتی اور لامرکزیت! پھر ان دونوں کے تصادم کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور اسے کوئی قوت نہ روک سکتی تھی۔ اس لئے عربوں کو اب اس فکر میں اپنا وقت نہ ضایع کرنا چاہئے کہ وہ یہودیوں کو فلسطین سے نکالدیں، بلکہ یہ سوچنا چاہئے کہ کہیں ایسا نہ ہو یہودی فلسطین سے آگے بڑھ کر سارے عربستان پر چھا جائیں، کیونکہ جس تیزی کے ساتھ وہ ترقی کر رہے ہیں، اور جن اصول پر وہ اپنی حکومت کی بنیاد قایم کر رہے ہیں، وہ تمام عربستان کو اپنے اندر جذب کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس میں شک نہیں کہ عرب ممالک کے لئے یہ بڑا سخت خطرہ ہے۔

پھر اس خطرہ کے دور کرنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے، بالکل وہی جس سے یہ خطرہ پیدا ہوا ہے یعنی اصلاح و ترقی کے وہی اصول جو یہود نے اختیار کئے ہیں اور اقتصادی بدحالی دور کرنے کے وہی طریقے جنھوں نے فلسطین کے ریگزاروں کو چند دن کے اندر "جنت عدن" میں تبدیل کر دیا۔ پھر حیرت کی بات یہ نہیں ہے کہ جن اصول کو پیش نظر رکھ کر آج یہود فلسطین پر چھائے جا رہے ہیں، وہ اسلام ہی کے متعین کئے ہوئے اصول ہیں، بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ جس "ہادی اکبر" نے یہ اصول بتائے تھے اسی کے متبعین آج اس سے منحرف نظر آتے ہیں اور اس خدائی فیصلہ کو بالکل فراموش کر چکے ہیں کہ

"ان الارض یرثہا عبادی الصٰلحون"

ہنڈس نے اپنی کتاب میں مسلم حکومتوں کے صرف اقتصادیات سے بحث کی ہے اور سیاسی پہلو کو نظر انداز کر دیا ہے غالباً اس لئے کہ یہ اس کے مطالعۂ سیاحت کا مقصود نہ تھا، لیکن جب تک تصویر کا دوسرا رخ (سیاست) سامنے نہ آئے، ان حقیقی اسباب کا پتہ نہیں چل سکتا جنھوں نے اسلامی ممالک میں یہ ہلچل پیدا کی اور نہ یورپ کے سرمایہ دارانہ ملکوں کی ان ریشہ دوانیوں کا علم ہو سکتا ہے، جن کا مقصود ہی اسلامی ممالک کو ہمیشہ زبوں حال بنائے رکھنا ہے تاکہ وہ انکی گرفت سے باہر نہ ہونے پائیں۔ اس لئے ہم سالنامہ کے دوسرے حصّہ میں تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہیں کہ پہلی جنگ کے وقت اور اس کے بعد اسلامی ممالک میں جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں ان کے اسباب کیا تھے اور بعد کو انھوں نے رفتہ رفتہ کیا صورتیں اختیار کیں، اس مقالہ کی ترتیب میں ہم نے ہیمڈن جیکسن کی کتاب پوسٹ وار ورلڈ سے مدد لی ہے، کیونکہ اس موضوع پر لکھنے والے مغربی مورخین میں جیکسن ہی تنہا وہ شخص ہے جس نے کافی دیانت سے کام لیا ہے اور عصبیت سے مغلوب نہیں

# جمہوریت ترکی

اسلام اور عیسویت کی تاریخ میں ایک مماثلت بہت عجیب پائی جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہ جس طرح چودھویں صدی عیسوی میں مسیحیوں نے پوپ اور مقدس سلطنت روما کا جوا گردن سے اتار کر اپنی اپنی قومی سلطنتیں علٰحدہ بنالیں، اسی طرح چودھویں صدی ہجری میں، خلافت کی زنجیر ٹوٹنے کے بعد مسلمانوں کی بھی متعدد حکومتیں قایم ہوگئیں۔

اس سے قبل ترکوں کی حکومت بہت وسیع تھی جس میں عربستان کی مسلم آبادی کے علاوہ یوروپ کے بعض حصوں کی عیسوی آبادی بھی شامل تھی، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں وہ انحطاط کی آخری منزل سے گزر رہی تھی۔ اور اس کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ نہ ہم اسے صحیح معنے میں مسلم حکومت کہہ سکتے تھے، نہ ترکی حکومت بلکہ سچ پوچھئے تو اسے خود مختار سلطنت بھی نہ کہہ سکتے تھے۔

مُسلم حکومت تو وہ اس لئے نہ تھی کہ مسلمانوں کی کثیر آبادی اس کے قلمرو سے باہر رہتی تھی، ترکی حکومت اس کو اس لئے نہ کہہ سکتے تھے کہ اس کی زبان عربی تھی، قوانین عربی تھے اور مذہبی علماء ہر جگہ دخیل تھے خود مختار حکومت نہ کہہ سکنے کا سبب یہ تھا کہ اپنے ملک کی غیر مسلم قوموں پر اسے کوئی اقتدار حاصل نہ تھا، ان کی عدالتیں الگ تھیں، ان کے قوانین علٰحدہ تھے اور حکومت کی طرف سے ان کو اجازت تھی کہ وہ اپنے تمام معاملات بالا بالا اپنے اپنے سفارت خانوں ہی کے ذریعہ سے طے کریں۔

سلطان عبدالحمید خاں ثانی (سنہ ۱۸۷۶ء تا سنہ ۱۹۰۹ء) نے ایک بار اس کی کوشش بھی کی کہ وہ دُنیا کے تمام مسلمانوں کے روحانی و دنیوی پیشوا تسلیم کرلئے جائیں اور اسی کوشش کے سلسلہ میں انھوں نے مسلمانوں کو متاثر کرنے کے لئے قسطنطنیہ سے مدینہ تک ریل کا سلسلہ بھی قایم کردیا، لیکن ان کے اس اقدام کو صرف سیاسی چال جان کر ایک طرف مہدی سوڈانی نے بغاوت کردی، دوسری طرف عرب میں وہابی تحریک شروع ہوگئی۔ اور ترکی حکومت مرکزی مسلم حکومت نہ بن سکی۔

جب ترکی کو روحانی پیشوائی حاصل کرنے کی امید ختم ہوگئی تو پھر اس نے یہ کوشش کی کہ اگر وہ مذہبی

حیثیت سے تمام دُنیا کے مسلمانوں کا مرکزِ امید نہیں بن سکتی تو شاہنشاہیت ہی کی حیثیت سے اس کو استوار کیا جائے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں کی ایک جماعت نے جو پیرس میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے تھے سوچا کہ کیوں نہ فرانسیسی حکومت کے اصول کو سامنے رکھ کر ایک ڈماکریٹک قسم کی حکومت قائم کی جائے جس میں مسلم، عیسائی، یہودی، ترک، عرب وغیرہ سب کو نمایندگی حاصل ہو، چنانچہ ۱۹۰۸ء میں "انجمن اتحاد و ترقی" کے نام سے سالونیکا میں سلطان ترکی کے خلاف نعرۂ انقلاب بلند کیا گیا اور جدید کانسٹی ٹیوشن کا مطالبہ شروع ہو گیا۔ خیال تھا کہ سلطان سختی سے اس تحریک کو دبائے گا، لیکن حالات دیکھ کر اس نے اس مطالبہ کو تسلیم کر... اور "انجمن اتحاد و ترقی" برسرِ اقتدار آگئی۔ اس میں شک نہیں کہ جماعتی تحریک کی یہ کامیابی بڑی کامیابی تھی، لیکن "انجمن اتحاد و ترقی" کے اس اقتدار کو بلقانی ریاستوں نے پسند نہ کیا اور ترکی کے خلاف جنگ شروع کر دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بلغاریہ نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا، یونان نے کریٹ پر قبضہ کر لیا، آسٹریا نے بوسنیا اور ہرزگووینا لے لیا اور اٹلی، طرابلس کو دبا بیٹھا۔

ان کو دیکھا دیکھی عربوں نے بھی ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ بغداد میں عراقی افسروں نے ایک خفیہ سوسائٹی آزادیٔ عراق کے لئے بنائی، دمشق میں بھی اسی طرح کی سوسائٹیاں شام کی خودمختاری کے لئے بننے لگیں، مکہ میں شریف حسین اپنی حکومت کا خواب دیکھنے لگا اور نجد میں ابن سعود نے وہابی حکومت کی طرح ڈال دی۔ اس میں شک نہیں کہ عربستان کی یہ تحریک آزادی برسوں تک کامیاب نہ ہوتی اور ترکی کی نئی حکومت اس کو بہ آسانی دبا دیتی، لیکن بدقسمتی سے اسی دوران میں جنگ شروع ہو گئی (۱۹۱۴ء) اور ترکی نے اپنی قسمت جرمنی کے ساتھ وابستہ کر دی۔

ترکی کی حکومت نے اس جنگ کو بڑی خدا ساز بات سمجھا۔ اس نے سوچا کہ جرمنی کے روپیہ سے وہ اپنی فوج کو مضبوط و آراستہ کر کے اپنے قدیم دشمن روس سے بھی انتقام لے سکے گی اور عرب حکومتوں کے سر سے بھی آزادی کا سودا نکال دے گی لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا، اور عربوں نے سوچا کہ حصول آزادی کا یہی بہترین موقعہ ہے، چنانچہ جس وقت برطانیہ کی طرف سے ہندوستانی فوج نے عراق پر حملہ کیا تو یہاں کی فوج نے کوئی مقابلہ نہیں کیا، اسی طرح دمشق میں بھی اہل شام نے کوئی مدد ترکی کی نہیں کی، نجد میں ابن سعود انگریزوں سے رشوت لیکر بالکل غیر جانبدار بنا رہا اور مکہ میں شریف حسین نے برطانیہ کے ہائی کمشنر متعینہ مصر سے گفتگو کر کے یہ طے کرا لیا کہ اگر اس نے قبایل عرب کو ترکی کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا تو عرب کا فرمانروا اسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

اول اول برطانیہ نے حسین کے وعدۂ امداد کو چنداں اہمیت نہ دی تھی کیونکہ درۂ دانیال کی طرف

اس نے خود قسطنطنیہ پر حملہ کرنا طے کر لیا تھا، لیکن انگریز اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور ترکی فوج نے بڑی پامردی سے مقابلہ کر کے درۂ دانیال سے انگریزوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ اسی اثناء میں شریف حسین نے بغاوت کر دی اور ترکوں نے اس کے خلاف مدینہ میں قلعہ بندی کر کے مکہ پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس واقعہ سے عربوں میں غیر معمولی جوش پیدا ہو گیا اور حسین کے تیسرے بیٹے فیصل اور ٹی۔ ای۔ لارنس کی قیادت میں تمام عرب قبائل نے مل کر حجاز کی طرف سے ترکوں کے خلاف خلیج سنائی پر دھاوا بول دیا۔

اسی کے ساتھ انگریزوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ مصر کی طرف سے براہِ شام، ترکی پر حملہ کریں۔ مقابلہ کے لئے مصطفےٰ کمال کو بھیجا گیا، لیکن چونکہ ترکی فوجوں پر دو طرف سے دباؤ پڑ رہا تھا اور عراق کی طرف سے بھی برطانوی فوجیں بڑھتی آ رہی تھیں، اس لئے ترکی کو مجبوراً نومبر ۱۹۱۸ء میں صلح کرنا پڑی اور معاہدۂ مدروس (MUDROS) کی رو سے، مصر اور عربستان کے علاقوں سے اسے دست بردار ہونا پڑا۔

ترکی کو مذہبی حکومت بنانے میں پہلے ہی ناکامی ہو چکی تھی، سلطان عبدالحمید نے ترکی کو مرکزی مسلم حکومت بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا، انجمن اتحاد و ترقی نے اس کو شاہنشاہیت بنانا چاہا اور کامیابی نہ ہوئی، اس لئے اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی کہ ترکی کو محض ترکی حکومت بنایا جائے، لیکن اس کی تکمیل کیونکر ہو اور کون اس اہم خدمت کو انجام دے، اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

سلطان وحیدالدین اپنی جگہ ڈر رہے تھے کہ اگر اب ترکی میں کوئی قومی تحریک شروع ہوئی تو اتحادیین اس بہانہ سے اناطولیا کو بھی ہتھیا لیں گے، اسی طرح انجمن اتحاد و ترقی بھی اپنی جگہ خائف تھی اور اس کے ارکان جنگ کی شکست کے بعد اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے۔ اب صرف ایک ہی شخص رہ گیا تھا جسے بھروسا تھا کہ قومی روح پھونک کر اب بھی ترکی کو بچایا جا سکتا ہے اور وہ مصطفےٰ کمال تھا، لیکن اس وقت وہ بھی قسطنطنیہ کے مضافات میں چھپا ہوا تھا، کیونکہ انگریز اس فکر میں تھے کہ اسے گرفتار کر کے مالٹا بھیجدیں۔

مصطفےٰ کمال بھی دوسرے لیڈروں کی طرح خود اس جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا جس کو اسے آزاد کرانا تھا، اس کا باپ البانی تھا اور ماں مقدونیہ کی۔ وہ ۱۸۸۱ء میں بمقام سالونیکا پیدا ہوا اور مدرسۂ حربیہ میں تعلیم پائی، ۱۹۰۵ء میں اس کو فوج میں کمیشن ملا اور اس کے بعد سے اس کی زندگی لڑائی میں بسر ہوئی۔ دروزیوں کو اس نے شکست دی، بلغاریہ سے اس نے جنگ کی، طرابلس میں اطالوی فوجوں کا اسنے مقابلہ کیا، قفقاز میں روسی افواج کے سامنے وہ سینہ سپر رہا اور گیلی پول میں اس نے برطانوی فوج کو

---

ے ڈی ویرا امریکن باشندہ ہے، ہٹلر آسٹریا سے تعلق رکھتا تھا، پلسوڈسکی لتھونیا کا متوطن تھا اور اسٹالین جارجیا میں پیدا ہوا۔

ناکوں چنے چبوا دیے۔ الغرض ایک محارب کی حیثیت سے اس کی قابلیت و اہلیت مسلم تھی اور ترکی سپاہ اس پر جان دیتی تھی، لیکن سیاسی حلقوں میں وہ اپنی صاف گوئی اور سخت کلامی کی وجہ سے مقبول نہ تھا اور انجمن اتحاد و ترقی کے ارکان سے اس کے تعلقات اچھے نہ تھے۔ خلیفہ اس سے مرعوب تھا لیکن دربار خلافت میں اس کے مخالف اتنے تھے کہ وہاں اس کے لئے کوئی جگہ نہ نکل سکتی تھی، اس لئے خلیفہ نے اسے ٹالنے کے لئے قسطنطنیہ سے باہر مشرقی اناطولیا کی طرف اس کمیشن کا افسر بنا کر بھیج دیا جو مشرقی اناطولیہ کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن مصطفےٰ کمال نے یہاں کی سپاہ و آبادی کو غیر مسلح کرنے کے بجائے اسے اور مسلح کرنا شروع کر دیا اور جب اس کی اطلاع سلطان وحید الدین کو ملی اور انھوں نے مصطفےٰ کمال کو واپس بلانا چاہا تو اس نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ میں آزادی اور خود مختاری حاصل کئے بغیر واپس نہ آؤں گا۔

مصطفےٰ کمال کا یہ خیال بظاہر ناممکن العمل تھا، کیونکہ سلطان اور ترکی حکومت اس کے خلاف تھی، اتحادیئن بھی اس کے دشمن تھے، چنانچہ سلطان نے کردوں کو اس کے خلاف جنگ پر آمادہ کیا اور ۱۹۱۹ء میں اتحادیوں کی مدد سے یونان نے سمرنا میں اپنی فوجیں اتار دیں، لیکن مصطفےٰ کمال نے انھیں واقعات سے فایدہ اٹھایا اور ترک آبادی کو یہ یقین دلاکر کہ سلطان اور اتحادیئن دونوں ترک قوم کو غلام بنانا چاہتے ہیں، عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیں اور وہ جوق در جوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔

مصطفےٰ کمال نے ہوا کا یہ رخ دیکھ کر نیشنل اسمبلی کے قیام کا اعلان کر دیا اور جون ۱۹۱۹ء میں بمقام ارض روم اس کا پہلا جلسہ طلب کیا۔ اس جلسہ میں مصطفےٰ کمال کو پریسیڈنٹ منتخب کیا گیا۔ ستمبر میں بمقام سیواس اس نے پھر اسمبلی کا جلسہ طلب کیا اور ایک مجلس عاملہ مرتب کر کے انگورا کو صدر مقام بنا لیا۔

مصطفےٰ کمال نے یہ سوچکر کہ عرب ریاستوں پر تو قبضہ ہو نہیں سکتا اور قسطنطنیہ کی حکومت اس کی مدد کے لئے طیار نہیں، یہ فیصلہ کیا کہ ترکی قوم کا بقا صرف اس طرح ممکن ہے کہ اس علاقہ میں جہاں ترک مسلمانوں کی اکثریت ہے خالص ترکی حکومت قایم کی جائے اور اس کا اعلان کر دیا۔

اس میں شک نہیں کہ ترکی کی نئی حکومت کے قیام کا یہ اعلان ایسا تھا جس کو نہ خلیفہ پسند کرتا تھا نہ اتحادیئن اور بالکل ممکن ہے کہ قوم پرست ترکوں کی جو جماعت اس کے ساتھ ہو گئی تھی، وہ بھی تازہ جوش ٹھنڈا ہونے کے بعد اس کا ساتھ چھوڑ دیتی، لیکن اتحادیوں نے سنہ۱۹۲۰ء میں تین ایسی غلطیاں کیں کہ ترک قوم کے جذبات حد درجہ مشتعل ہو گئے اور مصطفےٰ کمال کی قایم کی ہوئی حکومت زیادہ مستحکم ہو گئی۔

پہلی غلطی یہ تھی کہ انگورا کے نیشنل پیکٹ کے اعلان کے بعد اتحادیئن نے کہلا بھیجا کہ ترکوں کی نئی حکومت کو وہ تسلیم کرنے کے لئے طیار ہیں اگر قسطنطنیہ میں نیشنل اسمبلی کا جلسہ کر کے اس کا اعلان کیا جائے، انگورا کے

ڈیلی گیٹ اس خبر کو سنکر خوش ہوگئے اور اس نوید پر قسطنطنیہ جاکر انھوں نے پارلیمنٹ کے پورے اجلاس میں نیشنل پیکٹ کو منظور کرایا، لیکن اس کے دو مہینے بعد ہی اتحادی سپاہ نے قسطنطنیہ کی بہت سی سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرکے چالیس نیشنلسٹ لیڈروں کو گرفتار کرلیا اور مالٹا بھیجدیا۔ اس بدعہدی سے اتحادیین کے خلاف ترکوں میں عام بدظنی پیدا ہوگئی۔

دوسری غلطی معاہدہ سیورس تھا۔ جسکی رُو سے تھریس کا علاقہ اور سمرنا یونانیوں کو دیدیا گیا، عدلیہ اٹلی کو اور صرف کوہستانی علاقہ ترکوں کو ملا، اس تقسیم نے ترکوں کو بالکل یقین دلادیا کہ اتحادیین انھیں تباہ کردینے پر تلے ہوئے ہیں اور ان کی قومی اسپرٹ پوری قوت کے ساتھ اُبھر آئی۔

تیسری غلطی یہ تھی کہ اتحادیین (فرانس، برطانیہ، اٹلی) نے یونان کو ترکی پر حملہ کرنے کی ترغیب دی۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ترکی پر دباؤ ڈال کر معاہدہ کی شرایط تسلیم کرالی جائیں۔ یہ لڑائی تین سال سنہ۲۲ء تک جاری رہی اور اتحادیین نے یونان کی پوری مدد کی، لیکن آخرکار ترکوں کو فتح ہوئی اور معاہدۂ سیورس کالعدم ہوگیا۔ مصطفیٰ کمال کی یہ فتح معجزہ سمجھی جاتی ہے کہ اس نے صرف تیرہ ہزار ترک سپاہیوں سے جو پوری طرح مسلح بھی نہ تھے اور فنون جنگ سے بھی واقف نہ تھے، یونانیوں کی ۸۰ ہزار باقاعدہ آراستہ فوج کو باہر نکال دیا اور اپنا سارا علاقہ واپس لے لیا۔

ترکوں کی اس کامیابی کے بعد معاہدۂ لاسین (سنہ۱۹۲۳ء) وجود میں آیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکی کو پورا اناطولیا، مشرقی تھریس اور قسطنطنیہ مل گیا اسی کے ساتھ غیرملکیوں کو جو غیرمعمولی حقوق حاصل تھے وہ بھی ختم کردئے گئے، ۱۰لاکھ یہودی آبادی مشرقی اناطولیا سے یونان منتقل کی گئی اور اس طرح تاریخ میں بالکل پہلی مرتبہ ترکی کی قومی حکومت قایم ہوئی۔

لیکن اب مصطفیٰ کمال کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ اس حکومت کی بنیاد کو کیونکر استوار کیا جائے خود ترکوں کی کثیر آبادی سیاست سے بالکل ناواقف تھی اور وہ کوئی فیصلہ نہ کرسکتی تھی کہ کس قسم کی حکومت قایم کی جائے۔ بعض کا خیال تھا کہ سوویٹ یونین میں شامل ہوجانا چاہئے۔ بعض خالص اسلامی حکومت کے قیام کی طرف مایل تھے اور بعض اسے مغربی انداز کی جمہوریت بنانا چاہتے تھے، لیکن مصطفیٰ کمال نے ان سب کی مخالفت کی کیونکہ سوویٹ یونین میں شامل ہونا اس کے نزدیک اپنی آزادی کو ہاتھ سے کھودینا تھا، اسلامی حکومت میں پھر قدامت پسند طبقہ کے درخور کا اندیشہ تھا اور جمہوریت کا وہ اس لئے خلاف تھا کہ ترکی آبادی ابھی اس قابل نہ تھی کہ انتخاب اور رائے دہندگی کی اہمیت کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ فی الحال ڈکٹیٹرشپ ہی موزوں ہے۔

چنانچہ جب معاہدۂ لاسین کے بعد نیشنل اسمبلی کا اجلاس ہوا تو مصطفےٰ کمال اور عصمت بے نے ایک بل پیش کیا کہ ترکی کو جمہوری حکومت قرار دیا جائے اور کسی نہ کسی طرح اسے منظور کرا کے مصطفےٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہوگیا، اب مصطفےٰ کمال نئی جمہوریت ترکی کا صدر ہوگیا، اور اس کے اختیارات غیر معمولی وسیع ہوگئے۔ صدر کی حیثیت سے کابینہ پر اسے اقتدار حاصل ہوگیا، پارٹی کا لیڈر ہونے کی حیثیت سے سیاسی پالیسی پر پورا اختیار مل گیا اور کمانڈر انچیف کی حیثیت سے تمام فوجی نظام اس کے ہاتھ آگیا۔

مصطفےٰ کمال کو صرف ایک ہی دُھن تھی وہ یہ کہ ترکی قوم میں کسی طرح قوم پرستی کا صحیح جذبہ پیدا کیا جائے اور غیر ترکی عناصر کو نکال باہر کیا جائے اور صدر جمہوریہ ہونے کے بعد اس نے یہ کوشش شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں کئی باتیں اس کے سامنے تھیں، سب سے پہلے تو یہ کہ خلافت کے قصہ کو ختم کیا جائے، دوسرے یہ کہ ترکوں میں جو عربوں کی سی مذہبی ذہنیت پیدا ہوگئی ہے اسے دور کیا جائے اور تیسرے یہ کہ قدیم قوانین کو منسوخ کر کے جدید قوانین نافذ کئے جائیں۔ چنانچہ اپنے انتخاب کے چند مہینے بعد ہی اس نے سب سے پہلے منصب خلافت کے منسوخ کرنے کی تدابیر شروع کر دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ یہ کام آسان نہیں اور مسلمانوں کے دلوں میں جو روایتی احترام منصب خلافت کا صدیوں سے جاگزیں چلا آرہا ہے اس کو دور کرنا مشکل ہے، تاہم وہ ہر وقت اسی فکر میں سرگرداں رہتا تھا۔ اتفاق سے اس دوران میں سر آغا خاں نے منصب خلافت کے احترام کے بقا کے متعلق ترکی جمہوریت سے پر زور اپیل کی اور یہ اپیل مصطفےٰ کمال کے لئے بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس نے ترکی قوم کے سامنے اس مسئلہ کو اس صورت سے پیش کیا کہ سر آغا خاں نے یہ اپیل برطانیہ کے اشارہ سے کی ہے اور اس کا مقصود اس کے سوا کچھ نہیں کہ ترکی جمہوریت کو فنا کر دیا جائے۔

ترکوں پر اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور نیشنل اسمبلی نے باتفاق رائے منصب خلافت کی تنسیخ کا فیصلہ کر دیا۔ اس وقت عبدالمجید خلیفہ تھے۔ ان کو معزول کر کے معہ ان کے متعلقین کے یوروپ بھیجدیا گیا۔ نیشنل اسمبلی نے اسی کے ساتھ یہ بھی طے کر دیا کہ موجودہ قوانین بھی منسوخ کر کے جدید قوانین مغربی اصول پر طیار کر لئے جائیں اور اس پر بھی فوراً عملدر آمد شروع ہوگیا۔ لیکن چونکہ مذہبی خیالات یوں دفعتاً ختم نہیں ہوسکتے، اس لئے نیشنل اسمبلی کے حزب مخالف نے مصطفےٰ کمال کی مخالفت شروع کی اور کردستان میں بغاوت کرا دی۔ جب تین مہینے کے بعد مشکل سے یہ بغاوت فرو ہوئی تو مصطفےٰ کمال نے سوچا کہ کام یوں نرمی سے نہیں چلے گا، اسلئے اس نے پہلے تو اسمبلی سے حزب مخالف کے افراد کو نکالا اور پھر پوری سختی کے ساتھ اس نے ملاؤں اور مذہبی اداروں کو ختم کیا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ اقتصادی اصلاح کی طرف متوجہ ہوا۔ لیکن وہ سمجھتا تھا کہ جب تک ترکوں کی ذہنیت کو نہ بدلا جائے اس میں کامیابی ممکن نہیں، اس لئے اس نے سب سے پہلے تعلیمی نصاب کو بدلا اور تمام

مذہبی مکاتب و مدارس بند کرکے جدید مدارس مغربی اصول پر قایم کئے۔

وہ سمجھتا تھا کہ ذہنیت بدلنے کے لئے ظاہری وضع قطع کا بدلنا بھی ضروری ہے، اس لئے اس نے ترکی ٹوپی کی جگہ چھجے دار ٹوپی کو حکماً رائج کیا، برقع استعمال کرنا ممنوع قرار دیا اور رسم خط لاطینی کر دیا۔ ٹوپی اور رسم خط کا مسئلہ تو خیر اتنا سخت نہ تھا، لیکن پردہ کی ممانعت نے قصبات و دیہات میں کافی بےچینی پیدا کر دی کیونکہ وہاں کی عورتیں قدیم اسلامی روایات کی سختی سے پابند تھیں اور وہ بےپردگی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں، تاہم رفتہ رفتہ تمام مزاحمت دور ہوتی گئی اور ۶ سال کے عرصہ میں ترکی جمہوریت مغربی اصول پر قایم ہوگئی۔

اب مصطفےٰ کمال کے سامنے دوسرا اہم سوال اقتصادی اصلاحات کا تھا۔ وہ یہ تو جانتا تھا کہ ترکی اپنی آب و ہوا، زرخیز وادیوں اور صحرائی و معدنی پیداوار کے لحاظ سے ہر قسم کی زرعی و صنعتی ترقی کر سکتا ہے، لیکن ان قدرتی ذرایع سے فایدہ اُٹھانے میں ایک سب سے بڑا مانع حایل تھا یعنی یہ کہ حکومت بالکل مفلس تھی اور وہ نہ دوسرے ملکوں سے قرض لینا چاہتا تھا نہ یہ پسند کرتا تھا کہ وہاں کے سرمایہ دار یہاں آکر صنعت کو ترقی دیں۔ اس لئے سب سے پہلے زراعت کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور پہلے خود ایک فارم طیار کیا جس میں جدید آلات کشاورزی سے کام ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ اس نے آٹھ زراعتی کالج قایم کئے اور زراعتی بنک قایم کرکے کسانوں کو تخم اور زراعتی مشینری کی فراہمی شروع کر دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کسانوں میں جدید آلات کے ذریعہ سے زراعت کرنے کا رواج عام ہونے لگا اور رفتہ رفتہ وہاں کے تمام کسانوں نے اسے قبول کر لیا۔

اسی کے ساتھ دوسرا سوال صنعت و تجارت کی ترقی کا تھا۔ تجارتی نقطۂ نظر سے ترکی کی جغرافی پوزیشن نہایت اچھی ہے کیونکہ ایشیا اور یوروپ کے درمیان وہ ایک چوراہے کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح پیداوار کے لحاظ سے بھی ترقی کے اسباب اس کے پاس موجود ہیں۔ سمرنا کا انجیر، ترکی کا تماکو، روئی اور زیتون وہاں کی خاص اشیاء ہیں جن کی مانگ دُنیا میں بہت ہے۔ ہرچند جنگ کے بعد بین الاقوامی تجارت کے لئے اسباب مساعد نہ تھے لیکن مصطفےٰ کمال نے روس، اٹلی، یوگوسلیویا، رومانیا اور یونان سے تجارتی معاہدات کرکے حالات میں بہت کچھ تبدیلی پیدا کر لی تھی اور حمل و نقل کے لئے ہر سال ۱۵۰ میل ریلوے لائن بھی طیار کی جانے لگی۔

قیام جمہوریت سے قبل ترکی ہر قسم کی صنعت سے محروم تھا، اور گو قیام جمہوریت کے بعد متعدد فیکٹریاں قایم ہوئیں جن میں سگریٹ بنانے، قالین بُننے اور فوج کی وردی کے لئے پارچہ بافی کی فیکٹریاں خاص اہمیت رکھتی ہیں تاہم کوئی قابل ذکر ترقی اس میں نہ ہو سکی، ان حالات کو دیکھ کر وہاں کے کارخانہ داروں نے احتجاج کیا کہ حکومت آمدنی کا زیادہ حصہ فوج پر صرف کر رہی ہے اور صنعتی اداروں کی ہمت افزائی بہت کم ہوتی ہے، اس لئے یا تو روپیہ باہر سے قرض لیا جائے یا فوجی بجٹ کو کم کیا جائے۔

مصطفےٰ کمال نے اس احتجاج سے یہ نتیجہ نکالا کہ ترکی قوم میں غالباً اب اتنی بیداری پیدا ہوگئی ہے کہ وہ ملک کے مالیات اور اقتصادی مسایل کو سمجھ سکے، اس لئے اس نے عصمت پاشا کی قیادت میں حزب مخالف کے لئے بھی اسمبلی میں جگہ نکالی تاکہ ترکی قوم ایک ذمہ دار جمہوری حکومت کے صحیح اصول سے واقف ہوسکے۔ اس سے قبل وہاں ایک ہی پارٹی کی حکومت تھی اور حکومت کی تقریروں اور تجویزوں پر اظہار رائے بالکل ممنوع تھا اور کوئی اسکی مخالفت نہ کرسکتا تھا، لیکن اب حزب مخالف قایم کرکے آزادی کے ساتھ اظہار خیال کی عام اجازت دیدی گئی۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء میں فتحی پاشا کی سرکردگی میں ایک لبرل جمہوریت پسند پارٹی قایم کی گئی جو حکومت کی تجویزوں پر کھلی ہوئی تنقید کرے۔ لیکن اس کا نتیجہ اچھا نہ نکلا۔

ترکوں کی قدیم ذہنیت اس بات کو سمجھ ہی نہ سکتی تھی کہ حکمراں جماعت کی مخالفت بھی کوئی معقول بات ہوسکتی ہے، اس لئے انھوں نے مصطفےٰ کمال کے اس طرز عمل سے یہ سمجھا کہ اب وہ ضعیف ہوگیا ہے اور حکومت سنبھالنے کی طاقت اس میں نہیں رہی۔ اس خیال کا پیدا ہونا تھا کہ مختلف سمتوں سے قدامت پرست اور باغیانہ عناصر رکھنے والی جماعتوں نے شورش شروع کردی، سمرنا میں ایک شخص نے مہدی موعود ہونے کا دعویٰ کرکے لوگوں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرنا شروع کیا، کردوں نے پھر حکومت کے خلاف ہتھیار سنبھال لئے اور ملا پھر سر اٹھانے لگے۔ مصطفےٰ کمال نے مجبور ہوکر حزب مخالف کو توڑ دیا اور ان تمام شورشوں کو دبانے میں پوری سختی سے کام لیا۔

اس نے کہا کہ "ترک قوم ابھی اس قابل نہیں ہے کہ وہ مغربی اصول پر طریق حکمرانی کو سمجھ سکے اس لئے ضرورت ہے کہ میں کم از کم پندرہ سال تک اور آمرانہ حیثیت سے کام کروں اور ترک پبلک کو سیاسیات میں حصہ نہ لینے دوں"

الغرض ترک جمہوریت کا قیام اس میں شک نہیں کہ محض مصطفےٰ کمال کے غیر معمولی عزم و ثبات کا نتیجہ تھا اور وہ اپنی زندگی ہی میں سیاسی دنیا میں اس کے لئے ایک اہم جگہ پیدا کرگیا۔ مصطفےٰ کمال کے انتقال کے بعد بھی حکومت کی پالیسی قریب قریب وہی رہی جو اس نے قایم کی تھی، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر وہ زندہ رہتا تو دوسری جنگ عظیم میں اس کی پالیسی کیا ہوتی۔ تاہم اس جنگ میں ترکی کا غیر جانبدار رہنا اس کے لئے مفید ہی ہوا اور وہ ان تباہیوں سے بچ گیا جو دوسری حکومتوں پر شرکت جنگ کی وجہ سے نازل ہوئیں ۔۔۔ فی الحال اس نے اپنی قسمت اینگلو امریکن بلاک سے وابستہ کردی ہے اور اٹلانٹک پیکٹ میں شامل کئے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔ امریکہ نے مارشل پلان کے تحت ترکی کی کافی مدد بھی کی ہے، لیکن اس سے زیادہ تر فوجی تنظیم میں کام لیا گیا جو امریکہ کا اصل مقصود تھا اور ملک کے اقتصادی حالات کو درست کرنے میں اسے صرف نہیں کیا گیا۔

فوجی ترتیب و تنظیم اور تمدنی تہذیب و شایستگی کے لحاظ سے ترکی کا مقابلہ کوئی اسلامی حکومت نہیں کرسکتی اور اس لئے باوجود چھوٹی سلطنت ہونے کے یوروپ و امریکہ میں اس کی دھاک اور ساکھ کسی بڑی سلطنت سے کم نہیں۔

# عرب اور اتحادی طاقتیں

یہ بالکل صحیح ہے کہ جمہوریت ترکیہ کبھی قایم نہ ہوسکتی اگر پہلی جنگ کے وقت اتحادی طاقتوں نے عربستانی کے علاقہ سے اسے محروم نہ کر دیا ہوتا، لیکن سوال یہ ہے کہ خود اتحادیین نے عربستان کے متعلق کیا سوچا تھا، یہ معمہ آج تک حل نہیں ہو سکا۔

اہلِ عرب کو یقین تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ آزاد ہو جائیں گے جس کا وعدہ ان سے کیا گیا تھا اور اسی لالچ سے انھوں نے حجاز اور شام میں ترکوں کا مقابلہ کیا تھا، سر ہنری میکوہن (برطانوی ہائی کمشنر متعینہ مصر) نے جب مکہ کے گورنر حسین کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا تو حسین نے یہ شرط پیش کی کہ جنگ کے بعد پورا عربستان (عدن کے سوا) آزاد سمجھا جائے گا، میکوہن نے بصرہ، بغداد اور حلب بیروت کے بعض علاقوں کے سوا (جن پر برطانیہ و فرانس کو زیر اقتدار رہنا تھا) باقی تمام عربستان کی آزادی کا وعدہ برطانیہ کی طرف سے کر لیا تھا، لیکن جنگ ہنوز جاری ہی تھی کہ اہل عرب برطانوی وعدوں کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے لگے، کیونکہ انھیں پتہ چل گیا تھا کہ فرانس اور برطانیہ کے درمیان ایک خفیہ معاہدہ (۱۹۱۶ء میں) عرب کے مستقبل کے متعلق کچھ اور ہو چکا ہے۔ اس معاہدہ کے جو شرائط انھیں روسی ذرایع سے معلوم ہوئے وہ یہ تھے کہ عراق اور فلسطین کے دو بندرگاہ برطانیہ کے زیر سیادت رہیں گے، اور سواحل شام کا علاقہ معہ دمشق، حلب اور موصل کے فرانس کے زیر اثر رہے گا۔ اسی وقت برطانیہ نے یہودیوں سے بھی یہ وعدہ کر لیا تھا کہ فلسطین میں وہ اپنا قومی وطن بنا سکیں گے۔ برطانیہ کی اس عہد شکنی کا عربوں کو اور زیادہ یقین اس واقعہ سے بھی ہو گیا کہ اس نے صوبۂ عراق میں فوجی حکومت قایم کر دی جو ہندوستانی افسروں پر مشتمل تھی۔

تاہم جب لڑائی ختم ہوئی اور صلح کے اصول و شرایط متعین ہونے لگے تو پریسیڈنٹ ولسن کے بتائے ہوئے چودہ نکات کے پیش نظر عربوں کو پھر اپنی آزادی کی توقع قایم ہو گئی، کیونکہ پریسیڈنٹ ولسن نے حکومتوں کی قسمت کے فیصلہ کو زیادہ تر رائے عامہ پر منحصر رکھا تھا۔ لیکن عربوں کی اس امید پر سب سے پہلی ضرب تو یہ پہونچائی گئی کہ صلح کانفرنس (پیرس) میں مصر کے نمایندہ کو شرکت سے باز رکھا گیا اسی طرح عربستان کے دوسرے نمایندے

بھی اس کانفرنس میں شریک نہیں کئے گئے، صرف حجاز کی نمایندگی قبول کی گئی اور وہ بھی حسین نہیں بلکہ اسکے بیٹے فیصل کو نمایندہ تجویز کیا گیا کیونکہ اس نے کہدیا تھا کہ میں دمشق سے زیادہ کسی اور چیز کی تمنا نہیں رکھتا۔

## سرزمین عرب کی تقسیم

اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ارکان صلح کانفرنس کے لئے مشرق وسطیٰ کا مسئلہ اتنا زیادہ اہم نہ تھا جتنا جرمنی کے بٹوارہ کا اور سب اسی میں مصروف تھے علاوہ اس کے بڑی بڑی طاقتوں کے بعض نمایندے عربستان کے حالات سے زیادہ واقف بھی نہ تھے، وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ جزیرہ نمائے عرب نام ہے ایک بہت بڑے صحرا اور صرف اس کے سواحل کا جو اقتصادی، زرعی اور سیاسی حیثیت سے کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے، مصر صرف نہر سویز کی وجہ سے نگاہ میں تھا اور فلسطین، شام و عراق کی اہمیت صرف اس لئے تھی کہ ہندوستان کا راستہ اِدھر سے بھی جاتا ہے، موصل اور خلیج فارس کی اہمیت البتہ پٹرول کے چشموں کی وجہ سے کچھ زیادہ سمجھی جاتی تھی۔ رہا عرب کا مرکزی حصہ سو اس سے وہ بالکل ناواقف تھے یہاں تک کہ ابن سعود اور اس کی وہابی تحریک کا بھی انھیں کوئی علم نہ تھا۔ ان کا تنہا مشیر صرف لارنس تھا اور وہ خود بھی ابن سعود اور اس کی تحریک سے زیادہ آگاہ نہ تھا۔

صلح کانفرنس میں کبھی کبھی مشرقِ وسطیٰ کا بھی ذکر آجاتا تھا اور دو مختلف رائیں اس سلسلہ میں ظاہر کیجاتی تھیں، ایک جماعت تو یہ کہتی تھی کہ عربوں سے جو وعدہ آزادی کا کیا گیا ہے وہ پورا کرنا چاہئے، دوسری جماعت یہ کہتی تھی کہ اگر برطانیہ نے عراق چھوڑ دیا تو ترکی پھر اس پر قابض ہو جائے گا اور نہر سویز بھی ہاتھ سے نکل جائے گی علاوہ اس کے فرانس بھی اس پر آمادہ نہ تھا کہ شام سے اس کا اقتدار اُٹھ جائے۔

## اصول تولیت

آخر کار ۱۹۱۹ء میں یہ طے پایا کہ وہ مستعمرات یا ریاستیں جو جنگ کے بعد دوسری حکومتوں کے اثر سے آزاد ہو گئی ہیں (مثلاً عرب جو ترکی کی حکومت سے علٰحدہ ہو گیا ہے) ترقی یافتہ حکومتوں کی نگرانی میں دیدی جائیں تاکہ وہاں کی آبادی کو آزاد و خود مختار حکومت قایم کرنے کا اہل بنایا جاسکے وہی پرانی چال جو دوسرے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لئے مغربی حکومتیں ہمیشہ چلتی رہی ہیں، عرب کے مسئلہ میں بھی چلی گئی۔

اس اُصولی بات کے طے ہونے کے بعد یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک بین الاقوامی کمیشن خود عربستان جاکر یہ معلوم کرے کہ وہاں کے لوگوں کی کیا رائے ہے لیکن چونکہ فرانس نے اپنا کوئی نمایندہ اس کمیشن میں مقرر نہیں کیا تھا اس لئے اس تجویز پر عمل نہ ہو سکا اور اتحادیوں نے خود ہی ۱۹۲۰ء میں یہ فیصلہ کر دیا کہ:

۱- عراق، برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔

۲- شام اور کوہستان طارس و صحرائے سینا کا درمیانی علاقہ برطانیہ و فرانس کے درمیان اس طرح تقسیم کرا دیا جائے گا کہ فلسطین اور شرق اردن کی تولیت میں رہیں گے اور جنوبی حصہ یعنی سواحل لبنان اور دمشق، فرانس

کی تولیت میں اسی کے ساتھ شریف حسین کو جس کی عمر ۷۰ سال کی تھی حجاز کا فرمانروا تسلیم کیا گیا اور وہ بھی صرف اس لئے کہ حجاز اقتصادی حیثیت سے کوئی اہم چیز نہیں اور صرف حجاج ہی اس کی آمدنی کا ذریعہ ہیں۔ حسین کا ولی عہد اس کا بڑا بیٹا علی مقرر کیا گیا، دوسرے بیٹے عبداللہ کو زیر سیادت برطانیہ والی عراق تسلیم کیا گیا اور فیصل کو دمشق دیدیا گیا۔ الغرض اس طرح شریف کے خاندان والوں کا منہ بند کر دیا، لیکن سلطنت عثمانیہ سے جدا ہونے والے دوسرے علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ آرمینیا بدستور ترکوں کے پاس رہا، مصر، برطانیہ کے سیادت سے باہر نہ نکل سکا، اور ابن سعود سرزمین نجد میں چاروں طرف شریفی خاندان والوں سے گھر گیا۔

## شام اور فرانس

شام میں فرانس کی تولیت وہاں کے باشندوں کی مرضی کے بالکل خلاف تھی، اور ہر چند شام کی ۳۰ لاکھ کی آبادی جس میں مسلم کاشتکار و زمیندار، دروزی قبایل، لبنانی تاجر شامل ہیں اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے لحاظ سے باہمدگر متفق نہ تھے، لیکن تولیت کے سب مخالف تھے اس لئے فرانس کو فوجی طاقت سے اپنی تولیت قایم کرنا پڑی اور اگست سنہ ۲۰ء میں فیصل کو دمشق سے نکال کر وہاں فوجی حکومت قایم کردی اور شام کو پانچ حصوں میں تقسیم کرکے پانچ جداگانہ ریاستیں قایم کردیں جن کا نظم و نسق، بجٹ، جھنڈا سب علحدہ تھا۔

اہلِ شام کو یہ تقسیم سخت ناگوار ہوئی اور عیسوی اقلیت کے ساتھ جو غیر معمولی مراعات روا رکھی گئیں انھوں نے مسلمانوں کو بہت برہم کردیا۔ دروزی قبایل نے اس کی عملی مخالفت شروع کردی اور جب یہ مخالفت زیادہ سنگین ہوگئی تو سنہ ۲۵ء میں فرانسیسی حکومت نے دھوکا دیکر دروزی لیڈروں کو دمشق گفتگو کے لئے بلایا اور انھیں قید کرلیا۔ اس واقعہ سے سخت برہمی پیدا ہوگئی اور دروزیوں نے پوری قوت کے ساتھ بغاوت شروع کردی۔ فرانسیسیوں نے اس کے جواب میں مسلسل ۲۴ گھنٹے تک دمشق پر گولہ باری کرکے اسے کھنڈر کردیا۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا گیا بلکہ اس کے بعد فرانسیسی افواج کی تعداد یہاں ۵۰ ہزار بڑھادی گئی اور دیہات بھی کثرت سے جلادئے۔

اس واقعہ سے تمام دنیا میں سنسنی پھیل گئی اور فرانس کو مجبور کیا گیا کہ وہ کوئی سمجھوتا کرے۔ فرانس نے ایک آزمودہ کار شخص ہنری جوناں کو یہاں کا گورنر بنا کر بھیجا اور اس نے بجائے تولیت قایم رکھنے کے اہلِ شام سے مستقل معاہدہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی بار اہلِ شام نے یہ محسوس کیا کہ وہ فرانسیسی حکومت کے ساتھ تعاون کرسکتے ہیں۔

تولیت کی کمیشن یہ بات پہلے ہی طے کرچکی تھی کہ آزاد انتخاب کے ذریعہ سے کانسٹی ٹونٹ اسمبلی کے ارکان

چنے جائیں اور برطانیہ نے عراق نے بھی اسی اصول پر عمل کیا تھا، اس لئے شام کے فرانسیسی گورنر نے بھی اسی اصول پر عمل کیا اور دو سال کے اندر یہاں اسمبلی قایم ہوسکی۔ اس کے بعد نومبر ۱۹۳۶ء میں جب گورنر نے اسمبلی کے سامنے شرائط معاہدہ پیش کیں تو کثرت رائے سے اسے اہل شام نے رد کردیا۔ کیونکہ ان شرائط کی رو سے شام کی تقسیم پانچ ریاستوں میں بدستور قایم رکھی گئی تھی اور حکومت فرانس کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ شام میں جتنی فوج چاہے رکھے اور جتنے ہوائی اڈے چاہے قایم کرسکتا ہے۔

## برطانیہ اور یہود

فرانس کو جو ناکامی شام میں ہوئی اس سے زیادہ برطانیہ کو فلسطین میں ہوئی ہرچند عرب دونوں سے نفرت کرتے تھے، لیکن فرق یہ تھا کہ شام میں کم ازکم انھیں یہ تو معلوم تھا کہ فرانس کا کیا ارادہ ہے، لیکن فلسطین کے معاملہ میں تو برطانیہ کے ارادوں کی خبر ہی نہ تھی اور بیم و رجا کی کیفیت طاری تھی۔

ایک طرف برطانیہ یہ بھی کہتا جاتا تھا کہ وہ عربوں کا طرفدار ہے اور دوسری طرف ہر سال ہزاروں یہودیوں کو بھی فلسطین میں بساتا جارہا تھا۔

جو یہودی یہاں آرہے تھے وہ زیادہ تر صیہونی[1] جماعت کے تھے اور عرب انھیں کی طرف سے بہت مشتبہ تھے۔

برطانیہ نے جنگ سے پہلے یہودیوں کے قومی وطن کے لئے اوگانڈا تجویز کیا تھا لیکن ڈاکٹر ویزمین نے جو صیہونی لیڈر تھا اس تجویز کو رد کردیا۔ ڈاکٹر ویزمین نے دوران جنگ میں برطانیہ کی بڑی اہم خدمت انجام دی تھی، ایک بار جنگ میں برطانیہ کو بڑی مشکل پیش آگئی تھی یہ کہ برطانیہ میں الکحل جو پھٹنے والے گولوں کی طیاری کے لئے ضروری تھا بالکل ختم ہوگیا تھا اور اس کا حصول کسی طرح ممکن نہ تھا اسوقت ڈاکٹر ویزمین نے لکڑی سے الکحل طیار کرکے برطانیہ کو اس خطرہ سے بچا لیا تھا اور جب اس سے اس خدمت کا معاوضہ پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ میں اسکے سوا کچھ نہیں چاہتا کہ "میری قوم کے لئے کچھ کیا جائے"۔

ظاہر ہے کہ ڈاکٹر ویزمین کی خواہش کو برطانیہ رد نہ کرسکتا تھا اس لئے نومبر ۱۹۱۷ء میں برطانیہ نے اعلان کردیا (جسے اعلان بالفور کہتے ہیں) کہ "حکومت برطانیہ فلسطین کو یہود کا قومی وطن قرار دینے کی طرفدار ہے

---

[1] صیہونیت کی تحریک ایک یہودی فیلسوف ڈاکٹر ہرٹزل نے ۱۸۹۷ء میں شروع کی تھی جس کا مقصود یہ تھا کہ فلسطین کو یہودیوں کا قومی و مذہبی مرکز قرار دیا جائے اور تیس سال کے عرصہ میں تقریباً ایک لاکھ یہودی صیہونی ذہنیت کے فلسطین آکر آباد ہوگئے تھے۔

اور اس مقصد کی تکمیل کی پوری کوشش کرے گی، لیکن اسی کے ساتھ فلسطین میں جو یہودی آبادی پائی جاتی ہے اس کے حقوق بدستور قایم رہیں گے اور اسی اصول کے تحت فلسطین برطانیہ کی تولیت میں رہے گا۔"

اس اعلان سے مقصود یہ تھا کہ فلسطین میں عرب و یہود دونوں کی ملی جلی آبادی کی حکومت قایم کیجائے لیکن اس میں کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ یہود و عرب کے درمیان نفرت و اختلاف اب بہت زیادہ ہوگیا تھا اور ایک ہی پلیٹ فارم پر ان دونوں کا اجتماع مشکل تھا۔

بالفور اعلان سے قبل برطانیہ نے یہاں فوجی حکومت قایم کر رکھی تھی جو بہ نسبت یہودیوں کے عربوں کی طرف زیادہ مایل تھی (کیونکہ ۱۹۱۸ء میں انھوں نے برطانیہ کی بڑی مدد کی تھی) لیکن بالفور اعلان کے بعد اسپر عمل کرانے کے لئے سر ہربرٹ سموئل کو فلسطین بھیجا گیا۔ اس نے کوشش کی کہ وہ غیر جانبدارانہ طریقہ سے اس مسئلہ کو طے کرے، لیکن چونکہ وہ خود یہودی تھا۔ اس لئے یہودیوں نے اس کی پذیرائی ایک یہودی گورنر کی حیثیت کی اور عربوں نے صاف کہدیا کہ ہم تولیت کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے اور یروشلم اور یافہ میں سخت بدامنی پیدا ہوگئی۔ ہربرٹ نے ۱۹۲۲ء میں ایک عام انتخاب کی کوشش بھی کی، لیکن مسلمانوں نے اس میں مطلق حصہ نہیں لیا۔

اس کے بعد لارڈ کرومر کو ہائی کمشنر بنا کر بھیجا گیا، اتفاق سے اسی وقت کساد بازاری شروع ہوگئی جنے بہت سے یہودیوں کا دیوالہ نکال دیا، مسلمان اس کساد بازاری سے بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اب یہود خود ہی فلسطین چھوڑ کر چلے جائیں گے، لیکن عربوں کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی کیونکہ یہ کساد بازاری زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکی دوسری طرف لارڈ پلومر نے بھی استعفا دیدیا جس سے عرب بہت خوش تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں میں پھر بے چینی پیدا ہوئی اور یروشلم میں یہود و عرب نے ایک دوسرے سے لڑنا اور شہر کے امن و سکون کو تباہ کرنا شروع کر دیا۔

ان حالات کو دیکھ کر لارڈ پاسفیلڈ کی سرکردگی میں ایک تحقیقاتی کمیشن بھیجا گیا تاکہ وہ فلسطین کے حالات کی تحقیق کرکے رپورٹ مرتب کرے۔ لارڈ پاسفیلڈ نے تحقیقات کرکے اپنی رپورٹ وہائٹ پیپر کے نام سے شایع کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ فلسطین میں یہودیوں کی آمد کو محدود کر دینا مناسب ہوگا۔

اس رپورٹ پر یہودیوں میں ہنگامہ بپا ہوگیا اور آخر کار رمزے میکڈانلڈ کو اس کے سامنے جھک جانا پڑا۔ یہودیوں کا کہنا یہ تھا کہ "ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنانے کے لئے کروروں پونڈ صرف کئے ہیں، ہم نے یہاں کی سرزمین کو سرسبز و شاداب بنا کر قابل زراعت بنایا ہے، باغات نصب کئے ہیں، دودھ اور شہد کی نہریں بہادی ہیں جدید اصول پر سائنس سے کام لیکر وہ ہر طرح کی ترقی کے اسباب پیدا کر رہے ہیں، یافہ کے قریب اپنا نیا شہر تل عفیف کے نام سے آباد کیا ہے جس میں ۵۰ ہزار یہودی آباد ہیں، بحر مردہ سے ہم پوٹاش

نکالنے کی فکر میں ہیں اور پانی سے بجلی کی قوت پیدا کر رہے ہیں، اور ہم نے فلسطین کو اپنا قومی وطن بنا ناطے کر لیا ہے اس لئے ہم کسی روک ٹوک کو برداشت نہیں کر سکتے۔"

عربوں کا کہنا یہ تھا کہ: "فلسطین ہمارا ہے، وہاں ہماری اکثریت ہے، یہاں کی ترقی کی اسکیموں میں پچاس لاکھ پونڈ برطانیہ ان سے وصول کر چکا ہے، دس لاکھ پونڈ بندر گاہ حیفہ کی تعمیر میں انھوں نے ادا کئے ہیں اور یہودیوں کو حق حاصل نہیں کہ وہ فلسطین کو اپنا وطن بنائیں۔"

لیکن انگریزوں نے کسی ایک کی نہیں سنی اور جو کچھ انھیں کرنا تھا کیا، فلسطین کے ساتھ شرق یردن کو بھی اپنی تولیت میں لے لیا اور عبد اللہ (شریف حسین کے دوسرے بیٹے) کو یہاں کا برائے نام فرمانروا بنا دیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۵ء میں عمان اور عقبہ کو بھی شرق یردن میں شامل کر کے یہاں ہوائی اڈے بنالئے۔

یہ تو سب کچھ ہوا اور برطانیہ و فرانس نے اپنی تولیت کے قیام کے لئے بہت کچھ بندوبست کر لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شام و فلسطین دونوں جگہ تولیت ناکام ثابت ہوئی اور اس کا تنہا سبب یہ تھا کہ شام میں فرانسیسیوں نے عیسائی اقلیت کا اور فلسطین میں برطانیہ نے یہود اقلیت کا ساتھ دیا۔

## سعودی عرب

انگریزوں نے شریف حسین اور اس کے خاندان والوں میں عرب کا بٹوارہ کر کے یہ سمجھا تھا کہ چونکہ یہ خاندان نبوت سے ہیں اس لئے اہل عرب مطمئن ہو جائیں گے اور اس خاندان کی وساطت سے وہ ان پر قابو پا سکیں گے، لیکن نتیجہ توقع کے خلاف نکلا، کیونکہ شریف حسین قطعاً حکومت کا اہل ثابت نہیں ہوا اور اس نے اہلِ حجاز کو سخت برہم کر دیا، اس نے حجاز میں قدیم انداز کی ملوکیت قائم کر کے سب کچھ اپنے ہی لئے مخصوص کر لیا، ملازمین کو تنخواہیں بھی بروقت نہ دیتا تھا، اور آمدنی کا ایک ایک پیسہ اپنے ہاتھ میں رکھ کر جو چاہتا تھا صرف کرتا تھا، فوج کو پورا راشن بھی نہ دیتا تھا اور بدنظمی کا وہ عالم تھا گویا یہاں کسی کی حکومت ہی نہیں ہے، ان حالات کے تحت حجاز کی رعایا بہت پریشان تھی اور برہمی کے آثار ہر جگہ نمایاں تھے۔

اس سے قبل عرب کے وسطی حصہ میں وہابی تحریک شروع ہو گئی تھی جو ترکی کی خلافت کو تسلیم نہ کرتی تھی۔ یہ تحریک اس قدر مقبول ہوئی اور عربوں نے اس کا اتنا ساتھ دیا کہ حجاز کے دونوں مقدس مقامات مکہ اور مدینہ پر بھی وہابیوں کا قبضہ ہو گیا اور عبد العزیز وہابی لیڈر نے نجد کی فرمانروائی کا اعلان کر دیا۔ لیکن ۱۸۸۵ء میں اسے ترکوں نے نکال باہر کیا۔ اس وقت اس کے بیٹے ابن سعود کی عمر ۵ سال کی تھی اور اپنے باپ کے ساتھ یہ بھی خلیج فارس میں جلاوطنی کی زندگی بسر کر رہا تھا، بیس سال کی عمر میں اس نے خلیج فارس کو چھوڑا اور چھوٹی سی جماعت کے ساتھ نجد کے پایۂ تخت پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اس نے اپنی جد و جہد مسلسل جاری رکھی اور دس سال کے اندر اس کی قوت اتنی ہو گئی کہ ترکی حکومت کو تشویش پیدا ہو چلی اور اس نے شریف حسین

کو مدد دے کر، ابنِ سعود کے مقابلہ پر آمادہ کیا۔ شریف حسین نے ابن سعود کے بھائی کو گرفتار کرلیا اور اسے مجبور کیا کہ ترکی حکومت کی سیادت کو تسلیم کرے اور ایک ہزار پونڈ تاوان ادا کرے۔ یہ واقعہ ۱۹۱۲ء کا ہے اور یہی ابتدا تھی شریفی خاندان اور وہابی جماعت کی مخالفت کی جو اب تک چلی جارہی ہے۔

ابن سعود کے متبعین زیادہ تر خانہ بدوش قبایلی لوگ تھے جن کی معاش کا انحصار صرف لوٹ مار پر تھا اور وہ کسی ایک جگہ جمکر نہ رہتے تھے، ابن سعود نے وہابی تحریک کے سلسلہ میں یہ بھی کوشش کی کہ ان قبایل کی قزاقانہ عادت کو ترک کرایا جائے، چنانچہ اس نے ایک ادارہ اخوان کے نام سے قایم کرکے ان لوگوں کو اسکا ممبر بنایا اور حلف وفاداری لیکر ان کی فوجی تنظیم شروع کردی۔ ان لوگوں کو اس پر بھی آمادہ کیا گیا کہ وہ صحرائے عرب کے شاداب مقامات میں مستقل سکونت اختیار کرکے کاشت کی طرف متوجہ ہوں۔ اس تحریک میں ابن سعود کو بہت کامیابی ہوئی اور چند دن میں وہابیوں کی قوت بہت بڑھ گئی۔

۱۹۱۳ء میں ابن سعود نے ترکوں سے بدلہ لینے کے لئے حاسا پر قبضہ کرلیا اور وہابی حکومت خلیج فارس تک وسیع ہوگئی۔ اس کے بعد جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو اتحادیوں نے پانچ ہزار پونڈ ماہوار کی رشوت دیکر ابن سعود کی غیر جانبداری خریدی اور شرط یہ قرار پائی کہ شریف حسین کو جو مدد دیجارہی ہے وہ وہابی حکومت کے خلاف استعمال نہ کی جائے۔ لیکن ۱۹۱۸ء میں شریف حسین نے اس عہد کو توڑ کر وہابیوں کے شہر خرما پر قبضہ کرلیا۔ ابن سعود نے چند دن بعد ہی اچانک حملہ کرکے پھر خرما کو چھین لیا اور حسین کے بیٹے عبداللہ کو بھی گرفتار کرلیا جو بعد میں قید سے بھاگ نکلا۔

۱۹۲۱ء میں ابن سعود نے پھر اپنی تاخت کا سلسلہ شروع کیا اور عراق کی حدود تک اپنی حکومت کو وسیع کرلیا۔ اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ وہابیوں سے گفتگوئے مصالحت ضروری ہے اور اس غرض سے کویت میں کانفرنس طلب کی گئی۔ لیکن باہم کوئی معاہدہ نہ ہوسکا۔ کیونکہ ابن سعود نے برطانیہ کی اس پالیسی کو پسند نہ کیا کہ عراق، حجاز اور شرق اردن میں شریفی خاندان کے افراد کو حکمراں بنایا جائے، دوسری طرف برطانیہ کو یہ گوارا نہ تھا کہ ابن سعود عراق کے حدود تک پہونچ جائے۔

۱۹۲۴ء میں جب مصطفٰے کمال نے منصب خلافت کو منسوخ کیا تو شریف حسین نے اپنے بیٹے عبداللہ کے اصرار سے اپنے خلیفہ ہونے کا اعلان کردیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب برطانیہ نے ابن سعود اور شریف حسین دونوں کو امداد دینا بند کردی تھی۔ ابن سعود نے شریف حسین کا اعلان خلافت سنکر تین طرف سے اس پر حملہ کردیا۔ شرق اردن اور عراق میں تو خیر اسے کامیابی نہ ہوئی اور برطانیہ کی ہوائی فوج نے بم گراکر ابن سعود کے شترسواروں کو تتر بتر کردیا، لیکن جدہ کی طرف علی کی فوج کو شکست دیکر اس نے مکہ پر قبضہ کرلیا۔ اس

فتح کے بعد جب ابن سعود مکہ میں داخل ہوا تو اس کا داخلہ فاتح کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ ایک احرام بند زایر کی حیثیت تھا اس کا اثر لوگوں پر بہت ہوا اور کہا جاتا ہے کہ سالہا سال کے بعد پہلی بار ابن سعود ہی کے زمانہ میں امن و سکون کے ساتھ لوگوں کو حج کرنا نصیب ہوا۔

اب ابن سعود، نجد و حجاز دونوں کا مالک تھا، لیکن ان دونوں مقامات میں دیرینہ قبایلی عداوت کو دور کرنا آسان نہ تھا۔ وسطی ریگزار عرب کے باشندے جو وہابی اصول کے پابند تھے، اول تو یونہی حجازیوں کے سخت دشمن تھے اور دوسرے وہ یہ دیکھتے تھے کہ مکہ میں ہر چہار طرف سے حجاج آتے ہیں اور آزادی کے ساتھ وہاں ممنوعات کا استعمال ہوتا ہے جو ان کے مسلک کے خلاف تھا۔ اس لئے نجد کے قبایل بیتاب تھے کہ حجاز پر حملہ کرکے وہاں کے قبایل کو نکال دیں، لیکن ابن سعود نے اپنے قبایل کے جذبات کو بڑی تدبیروں سے دبایا اور اسی دوران میں اس نے جدہ سے مکہ تک ریل اور موٹر سروس جاری کر دی، کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد سنہ ۲۶ء میں جتنے حجاج مکہ میں جمع ہوئے اس سے قبل کبھی نہ جمع ہوئے تھے۔ لیکن جماعت اخوان اب تک برہم تھی اور ابن سعود کے متعلق کہتی تھی کہ وہ وہابی اصول سے ہٹ گیا ہے اور عرب میں موٹریں چلاکر اور وائرلیس قایم کرکے اصول مذہب سے منحرف ہو گیا ہے۔ ابن سعود نے نجد کے سرداروں کو بلاکر بہت کچھ سمجھایا لیکن وہ نہ مانے اور بغاوت کرکے حدود عراق پر حملہ کر دیا۔

برطانیہ نے عراقیوں کی مدد کرکے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا اور جب یہ نجد واپس آئے تو ابن سعود نے انکے بہت سے لیڈروں کو قتل کرا دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجد و حجاز ایک ہو گئے اور ابن سعود کی حکومت بحر احمر سے لیکر خلیج فارس تک اور بحر ہند سے صحرائے شام تک قایم ہو گئی۔ اب اس کے لئے خطرہ کی چیز صرف وہ علاقہ تھا جو شمال میں برطانیہ کے زیر اقتدار تھا۔ اس لئے سنہ ۲۲ء میں اس نے شرق اردن اور عراق کے درمیان کا علاقہ بھی لینا چاہا، لیکن برطانیہ اسے کسی طرح گوارا کر سکتا تھا کیونکہ فلسطین سے خلیج فارس کا راستہ اسی طرف سے تھا اور اس کی پائپ لائن بھی یہیں، بچھی ہوئی تھی۔ آخرکار ابن سعود کو مجبوراً یہ خیال ترک کرنا پڑا اور اسے شرق اردن میں عبداللہ سے اور عراق میں فیصل اور فیصل کے بیٹے سے صلح کرنا پڑی۔

اس کے بعد صرف جنوبی حصہ ایسا رہ گیا تھا جہاں وہ کامیاب ہو سکتا تھا اس لئے ابن سعود نے سنہ ۳۴ء میں یمن پر حملہ کرکے اس پر بھی قبضہ کر لیا۔

ہر چند برطانیہ نے بہت کوشش کی کہ سعودی عرب کو بھی اپنی تولیت میں لیلے، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوا اور اب سرزمین عرب میں تنہا ابن سعود ہی کی حکومت ایسی ہے جو اپنے آپ کو صحیح معنی میں خود مختار و آزاد کہہ سکتی ہے اور بیرونی ممالک کے اثر سے بالکل پاک ہے۔

---

ابن سعود کے تعلقات اب امریکہ سے زیادہ وسیع ہوگئے ہیں اور اس نے اپنے ہاں کے پٹرولی چشموں کا ٹھیکہ امریکن کمپنی کو دے رکھا ہے جس سے اس کو لاکھوں پونڈ کی آمدنی ہوتی ہے۔ لیکن امریکہ جن ترکیبوں سے کام لے رہا ہے، وہ بڑی شاطرانہ ہیں، وہ آہستہ آہستہ یہاں پوری طرح چھایا جا رہا ہے اور ابن سعود ڈالروں کی لالچ کی وجہ سے اس حقیقت کو نظرانداز کرتا جا رہا ہے کہ سرزمین نجد و حجاز کو امریکہ کے موجودہ درمور کی وجہ سے ایک نہ ایک دن امریکہ کی کالونی بن جانا ہے اور اس کی آزادی کو ہمیشہ کے لئے سلب ہو جاتا۔

**عراق** جنگ عظیم سے قبل عراق کو کوئی بین الاقوامی خصوصیت حاصل نہ تھی۔ دوران جنگ میں سب سے پہلے دنیا کی توجہ اس کی طرف اس وقت مبذول ہوئی جب برطانوی جنرل ٹاؤن شنڈ کو ترکوں کے مقابلہ میں شکست ہوئی اور اس کے بعد اُس وقت جب مارچ ۱۹۱۷ء میں بغداد ترکوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانوی فوج کے ہاتھ آیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۸ء میں بصرہ، بغداد اور موصل کے علاقے بھی ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔

اس وقت یہاں کی آبادی ۲۰ لاکھ عراقیوں، ۵ لاکھ کردوں اور ڈھائی لاکھ اسیرین عیسائیوں پر مشتمل تھی۔ ترکوں کا یہاں اب کوئی اثر باقی نہ رہا تھا اور برطانیہ نے کرنل اے ٹی ولسن کی تجویز کے مطابق برطانوی افسروں کے ذریعہ سے یہاں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا، لیکن چونکہ وہائٹ ہال کی پارٹیوں میں عراق کے مستقبل کے متعلق اختلاف تھا، اس لئے کوئی خاص پالیسی اس باب میں متعین نہ ہوئی تھی۔

خود عراقیوں کے ذہن میں بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی واضح صورت نہ تھی، لیکن وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد وہ کسی اور حکومت کی غلامی میں نہ دیدئے جائیں۔

ولسن یہ چاہتا تھا کہ عراق، برطانیہ کی تولیت میں آجائے۔ اس نے لکھا تھا کہ "اگر ہم کو عرب کے متعلق اپنی پالیسی کو کامیاب بنانا ہے تو ہم کو ان سے سیاسی تعلقات استوار کرکے اپنی تجارتی پالیسی کو مضبوط بنانا چاہئے"۔

ولسن کا مقصود یہ تھا کہ عراق کو ترقی دیکر وہ اقتصادی، تعلیمی اور صنعتی حیثیت سے یوروپ کی سطح پر لے آئے، عربوں کے قبائلی نزاعات کو دور کرکے انھیں متحد و متفق کردے، لیکن یہ کوئی آسان بات نہ تھی، اور اس کے لئے بڑا زمانہ درکار تھا، تاہم اس نے بارہ مہینے تک اس تجویز میں سر کھپایا اور اسی قلیل مدت میں برطانیہ کے ۳ کرور پونڈ صرف ہوگئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔ آخرکار ۱۹۲۰ء ولسن واپس بلا لیا گیا۔

اس کے بعد جب بغداد میں یہ اعلان کیا گیا کہ عراق برطانیہ کی تولیت میں رہے گا، تو یہاں بغاوت شروع ہوگئی، کیونکہ وہ ترکوں کی غلامی سے آزاد ہونے کے بعد کسی اور کی غلامی قبول نہ کر سکتے تھے۔ اس ہنگامہ میں بہت سے

برطانوی افسران مارے گئے اور علاقہ فرات کا درمیانی حصہ برطانیہ کے قابو سے باہر ہوگیا۔

کرنل لارنس نے ایک خط کے ذریعہ سے ۲۲ جولائی سنہ ۲۰ء کے ٹائمس میں ان حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:۔

"دو سال کا انتظار کرنے کے بعد عراقیوں کے پیمانۂ صبر کا لبریز ہوجانا تعجب کی بات نہیں۔ جو حکومت ہم نے یہاں قایم کی ہے وہ انگریزی وضع کی ہے اور انگریزی زبان ہی میں وہ کام کرتی ہے۔ ۴۵۰ افسران میں سے ایک بھی عراق کا باشندہ نہیں، ترکوں کے زمانہ میں ۷۰ فی صدی افسران عراق ہی کے تھے ہماری ۸۰ ہزار فوج صرف فرایض پولیس ادا کرتی ہے اور سرحد کی حفاظت و نگرانی نہیں کرسکتی۔ ترکوں کے عہد میں یہاں کی فوج میں عربی افسر ۶۰ فی صدی تھے اور ۹۵ فی صدی دوسرے فوجی عہدہ دار بھی عرب ہی تھے، لیکن انگریزوں نے ان سب کو نکال دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عربوں اور عراقیوں میں برطانیہ کے خلاف بدظنی پیدا ہوگئی"

جولائی اور اکتوبر کے درمیان، عراقیوں سے جنگ کرنے میں دو ہزار برطانوی اور ہندوستانی افسران کام آئے اور ۸۴۵۰ عرب مارے گئے۔ اس خلفشار اور بدامنی کے دور کرنے کی صرف ایک ہی تدبیر تھی اور یہ کہ حکومت کا ذمہ دار زیادہ تر عربوں کو قرار دیا جاتا لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اکتوبر میں کرنل ولسن کی جگہ سر پرسی کاکس بھیجے گئے، انھوں نے بغداد میں سربرآوردہ عراقیوں کو بلاکر کابینہ بنانے کی ہدایت کی اور اس طرح تیرھویں صدی کے بعد سب سے پہلے عراقیوں کو ذمہ دار حکومت تفویض ہوئی۔ لیکن سچ پوچھئے تو یہ حکومت پھر بھی برطانیہ ہی کی تھی کیونکہ اہم معاملات کا فیصلہ اس نے خود اپنے ہی ہاتھ میں رکھا تھا۔

سنہ ۲۱ء میں جب قاہرہ کانفرنس منعقد ہوئی تو استعماری سکرٹری ونسٹن چرچل نے یہ فیصلہ کیا کہ عراق سے برطانوی فوج ہٹالی جائے اور اس کی جگہ ہوائی فوج رکھی جائے۔ اس سے منشاء یہ تھا کہ فوجی مصارف تو کم ہوجائیں لیکن دباؤ پہلے سے زیادہ بڑھ جائے، اسی کے ساتھ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ یہاں کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے، اس کے انتخاب میں بھی برطانیہ اور عراق کے درمیان کافی اختلاف رہا، لیکن آخرکار شریف فیصل کی سیادت عراقیوں نے منظور کرلی۔

**شریف فیصل** فیصل کی تمام زندگی مصائب ہی میں بسر ہوئی تھی، وہ ابھی نوجوان ہی تھا کہ سلطان عبدالحمید کے زمانہ میں مقید کرکے قسطنطنیہ بھیجدیا گیا، اور پھر حجاز میں عرصہ تک مقید رہا۔ اس کے بعد عرب بغاوت کی قیادت میں سرگرداں رہا اور آخر آخر جب دمشق کی حکومت اسے ملی تو فرانسیسیوں نے اسے نکالدیا۔ اب عراق کی حکومت ملی تو اس کی پوزیشن اور زیادہ نازک ہوگئی، ایک طرف تو عراقی رعایا اس سے

بدظن تھی کیونکہ وہ برطانیہ کا نامزد شخص تھا، دوسری طرف شام میں فرانسیسی پڑوسی اس سے برہم تھا کیونکہ دمشق سے اس نے اس کو نکالا تھا، پھر چونکہ وہ سُنّی تھا اس لئے ایرانی بھی خوش نہ تھے اور اپنے مقامات مقدسہ ایک سنّی کے ہاتھ میں دیکھنا پسند نہ کرتے تھے۔ شریفی خاندان کا فرد ہونے کی حیثیت سے ابن سعود سے اس کی دشمنی پہلے ہی سے تھی، الغرض عراق کا بادشاہ ہونے کے بعد فیصل کی پوزیشن بہت نازک ہوگئی لیکن چونکہ وہ آدمی تھا بڑے صبرو استقلال کا اس لئے اس نے ان تمام مشکلات پر آہستہ آہستہ قابو پالیا۔

فیصل کو ہدایت کی گئی تھی کہ جب وہ اپنی حکومت کا اعلان کرے تو اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر کردے کہ اقتدار اعلیٰ برطانوی ہائی کمشنر کا رہے گا، لیکن فیصل نے اس سے انکار کردیا اور کہا کہ: "حسب معاہدہ برطانیہ نے مجھے خود مختار فرمانروا تسلیم کیا ہے اور اس کے خلاف میں کوئی اعلان نہ کروں گا"

آخرکار ۱۹۲۳ء میں ایک مزید معاہدہ کی رو سے برطانیہ نے اسے عراق کا خود مختار فرمانروا تسلیم کرلیا۔ ۱۹۲۶ء میں شام کی فرانسیسی حکومت نے بھی اس کی یہ حیثیت مان لی اور شام و عراق کے درمیان سلسلۂ تجارت قایم ہوگیا۔ ایرانیوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس نے بغداد سے تہران تک سڑک بنوادی، اور ایران سے بھی معاہدہ ہوگیا۔

اب صرف ابن سعود رہ گیا تھا جس سے صلح و آشتی کے تعلقات قایم کرنا مشکل تھا، لیکن فیصل برابر اس کوشش میں لگا رہا اور آخرکار ۱۹۳۰ء میں وہ خود ابن سعود سے ملا اور اس طرح آپس کے تعلقات میں جو تلخی پائی جاتی تھی وہ بہت کم ہوگئی۔

**موصل**

موصل کی زیادہ تر آبادی کردوں پر مشتمل ہے اور اسی لئے جنگ کے بعد بھی ترکوں کا یہ اصرار باقی رہا کہ موصل کو ترکی حکومت میں شامل رہنا چاہئے۔ جمہوریت ترکی کا ارادہ یہ تھا کہ موصل کے ۵ لاکھ کردوں کو ان ۳۰ لاکھ کردوں کے ساتھ ملادے جو کوہستان زوغا کے شمال میں آباد ہیں اور اس طرح پورے کردستان کو اپنی قلمرو میں شامل کرلے۔ لیکن اتحادیئن یہ چاہتے تھے کہ شمالی کردستان کو علٰحدہ ایک مستقل حکومت بنادیا جائے اور اگر موصل کے کرد آبادی چاہے تو اس حکومت میں شامل ہوجائے۔ لیکن جب اتحادیئن اس میں کامیاب نہ ہوئے تو انھوں نے اپنی پالیسی بدل کر یہ ظاہر کیا کہ موصل کا عراق کی حکومت میں شامل رہنا ضروری ہے۔ کردوں کو یہ بات بہت ناگوار گزری کیونکہ عراقیوں سے ان کے تعلقات ہمیشہ سے خراب رہے تھے اور انھوں نے اس تحریک کا مقابلہ بھی کیا، لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے اور آخرکار موصل، عراق کو دینا طے پاگیا۔

پہلے سنہ ۱۶ء میں یہ صوبہ فرانس کو دینا تجویز ہوا تھا اس لئے شام کی فرانسیسی حکومت نے اس تجویز کی مخالفت کی، لیکن آخرکار اس نے بھی اسے تسلیم کرلیا، اس شرط کے ساتھ کہ یہاں کے پٹرولی چشموں کی آمدنی سے ایک چوتھائی اسے دیا جائے۔

چنانچہ اس کے بعد ایک کرور پونڈ کے سرمایہ سے عراق پٹرول کمپنی وجود میں آئی اور حیفہ سے طرابلس تک پائپ لائن بچھادی گئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عراقی حکومت اقتصادی حیثیت سے برطانیہ و فرانس کی دست نگر ہوگئی اور اب ہر وقت اس اندیشہ سے دوچار ہے کہ بصورت بد امنی مغربی طاقتیں اپنے اپنے سرمایہ کی حفاظت کے بہانہ سے فوراً اپنی فوجیں یہاں بھیجکر قبضہ کرلیں گی۔


## انقلاب حیدرآباد کی داستان پر پہلی کتاب

# "مشاہدات"

یعنی

## حضرت ہوش بلگرامی

### (المخاطب بہ نواب ہوشیار جنگ بہادر)

کے خود نوشتہ سوانحِ زندگی جو نہ صرف اپنی بلند انشا، بلکہ سیاسیات و مذہبیات پر بھی ایک بے لاگ حکیمانہ تبصرہ کے لحاظ سے اپنے رنگ کی بالکل پہلی کتاب ہے ـــ جناب ہوش کی عمر کا بڑا حصہ ریاستوں ہی میں بسر ہوا ہے اور ان کی پالٹکس کو شکل ہی سے کسی نے ان سے بہتر سمجھا ہوگا ـــــ یوں تو اس میں رام پور، بھوپال، گوالیار، ادے پور، الور، جے پور وغیرہ متعدد ریاستوں کے دلچسپ حالات نظر آتے ہیں، لیکن کتاب کا وہ حصہ جو "ریاست حیدرآباد اور اس کے انقلاب" سے تعلق رکھتا ہے، دیکھنے کی چیز ہے، کیونکہ اس کتاب کے لکھنے کا مقصود ہی حیدرآباد کی تاریخ انقلاب پیش کرنا تھا۔

جناب ہوش ایک چوتھائی صدی سے حیدرآباد کی پالٹکس اور دربارِ عثمانی کے رجحانات کا مطالعہ کررہے تھے اور نظام کے یہاں ہر وقت کی حضوری کی وجہ سے وہاں کی ان تمام اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے واقف تھے جو کسی دوسرے کے علم میں آہی نہ سکتی تھیں ـــــ رضاکار تحریک، اربابِ حکومت کی سازشیں، سچّے مشیروں کی مشکلات، دربارِ عثمانی کے حیرتناک حالات، سیرتِ نظام کی عجیب و غریب خصوصیات، پولیس ایکشن کی داستان، اور اسکے بعد نظام اور اہلِ ملک پر اس کا ردِّ عمل ـ اگر آپ ان تمام واقعات کی صحیح تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو "**مشاہدات**" ملاحظہ فرمایئے۔

**منیجر نگار۔ لکھنؤ**

کاغذ ولایتی۔ حجم ۶۰۰ صفحات۔ ۱۰ تصاویر۔ نفیس جلد۔ قیمت دس روپیہ علاوہ محصول

# مصر

برطانوی شہنشاہیت نے جس چالاکی و ہوشیاری سے مصر میں آہستہ آہستہ اپنے پاؤں جمائے ہیں اس کی مثال دنیا کی کسی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مصر کے ساتھ برطانیہ کی دلچسپی سب سے پہلے اسی وقت شروع ہو گئی تھی جب نپولین اول نے برطانیہ کے مشرقی ذرایع آمد و رفت کو دریائے نیل کی طرف سے خطرہ میں ڈال دیا تھا، لیکن جب نپولین سوم کے عہد میں نہر سویز طیار ہوئی تو یہ دلچسپی اور زیادہ بڑھ گئی۔

ہرچند یہ کمپنی فرانس کی تھی لیکن ہر ملک اس کے حصّے خرید سکتا تھا اور چونکہ اس کا تعلق سرزمین مصر سے تھا اس لئے اصولاً چاہئے یہ تھا کہ مصر ہی اس میں زیادہ حصہ لیتا، لیکن خدیو مصر کے پاس روپیہ نہ تھا۔

اس موقعہ سے فایدہ اٹھاکر برطانیہ نے نصف سے زیادہ حصّے خرید لئے اور اس مالی تعلق کے پیدا ہو جانے کی وجہ سے مصر پر اپنا اقتدار قایم رکھنے کا خیال اس کے دل میں پیدا ہوا۔ اتفاق سے اس کے بعد ہی عربی پاشا نے خروج کیا اور برطانیہ کو فوجی تسلط قایم کرنے کا بھی بہانہ ہاتھ آگیا۔ لیکن یہ تسلط جس ہوشیاری سے ۲۲ سال تک قایم رکھا گیا وہ برطانوی سیاست دانی کی بڑی زبردست چال ہے۔

مصر، سلطنت عثمانیہ میں شامل تھا اور خدیو مصر اس کا ماتحت تھا، لیکن انگریزوں نے اس تعلق کی اہمیت کو کبھی چیلنج نہیں دیا بلکہ اس کو بدستور قایم رکھنے کی کوشش کی حتے کہ جو انگریز خدیو مصر کی ملازمت میں تھے انھوں نے انگریزی ٹوپی بھی اتار پھینکی اور ترکی ٹوپی پہننا اختیار کیا۔ فوج کی ملازمت میں انھوں نے پاشا کا لقب اختیار کرنا منظور کر لیا اور مصریوں کے ساتھ ایسے گھُل مل گئے گویا وہ مصر ہی کے اصل باشندے تھے۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ یہ سلسلہ برابر ۲۲ سال تک جاری رہا یہاں تک کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ شروع ہوئی اور برطانیہ کو اپنا نقاب دوستی اتار پھینکنے کا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چونکہ اس جنگ میں ترکی، اتحادیئن کے خلاف تھا اس لئے دسمبر ۱۹۱۴ء میں برطانیہ نے اعلان کر دیا کہ "مصر، ہز مجسٹی کی حفاظت میں لے لیا گیا ہے اور آیندہ وہ برطانیہ کی تولیت میں رہے گا"

لیکن اس کے بعد بھی برطانیہ نے اپنی پالسی کو گول مول ہی رکھا اور ظاہر یہی کیا کہ مصر خود مختار رہے،

چنانچہ خدیو کا لقب بدل کر سلطان کر دیا اور یہ ظاہر کیا کہ موجودہ تولیت عارضی ہے اور صرف جنگ کے محدود رہے گی۔

ہر چند مصر کو اتحادیئن کے ساتھ جنگ میں شریک ہونے کی دعوت نہیں دی گئی اور اس کی ج غیر جانبدار ملک کی سی تھی، لیکن جیسا کہ لارڈ لائیڈ نے ظاہر کیا تھا در اصل وہ نیوٹرل تھا اور نہ لڑا شریک، اس کی حیثیت ایک فوجی کیمپ کی سی تھی، جہاں اتحادی فوجوں کا زبردست اجتماع رہتا تھا کے تمام ذرائع پیداوار و ترقی یا تو اتحادیئں کے تصرف میں تھے یا بالکل معطل اور ان کا مستقبل بالکل ب کے رحم و کرم پر منحصر تھا۔ اگر مصر واقعی صحیح معنی میں نیوٹرل رہتا تو بھی غنیمت تھا، لیکن ہوا یہ کہ مصر کو میں دعوت نہ دینے کے باوجود، اس کے فوجی دستوں کو ترکوں کے خلاف استعمال کیا گیا، وہاں کے غریب کاشتکاروں کو زبردستی بھرتی کرکے میدان جنگ کے طرف بھیج دیا گیا، اس لئے دریائے نیل کا سا مارشل لاء کے تحت آگیا، دو لاکھ اتحادی فوجوں کے لئے پانی اور لکڑی لانے کے لئے مصر ہی کے غریب کاشتک کو مجبور کیا گیا، غلّہ اور روئی کی تمام پیداوار نہایت معمولی قیمت دیکر لے لی گئی، اور مصر کے تمام خچر اور او کے لئے زبردستی حاصل کئے گئے۔

ان حالات میں مصری قوم کی پریشانیوں اور بے چینیوں کا جو عالم رہا ہوگا، ظاہر ہے، اس کے لڑائی ختم ہوئی اور ولسن نے شرائط صلح کے لئے اپنے بارہ نکات پیش کئے تو مصر کو کچھ امید قایم ہوئی کہ آزاد ہو جائے گا۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ صلح کانفرنس میں اس کو شرک اجازت نہیں مل سکتی، حالانکہ حبشہ اور حجاز کے نمائندوں کو اس کی اجازت مل گئی تھی۔

اس واقعہ سے مصریوں کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ سمجھ گئے کہ برطانیہ کا ارادہ مصر کے باب میں کیا ہے اس کا ردّ عمل یہ ہوا کہ زاغلول پاشا کی سیادت میں وفد پارٹی قایم ہوئی اور مصر کی مکمل آزادی کا مطالبہ ہوا۔ اس کا جواب برطانیہ نے یہ دیا کہ زاغلول پاشا اور اس کے دو ساتھیوں کو مارچ ۱۹۱۹ء میں جلا کر دیا۔ اس واقعہ سے قوم پرستوں میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا اور انھوں نے تشدد کی پالیسی پر عمل ک گیا، قاہرہ کے چاروں طرف ریل، تار اور سڑکوں کا سلسلہ تباہ و برباد کرکے، قاہرہ کو گویا ساری دنیا سے کر دیا۔ سوڈان ریلوے کو بھی متعدد جگہ نقصان پہونچایا۔ گو یا اس سلسلہ میں عام خونریزی نہیں ہوئی کہیں کہیں مصریوں کے جذبات زیادہ مشتعل ہو گئے اور اس سلسلہ میں کچھ انگریزوں کی جانیں بھی تلف ہو

اب برطانیہ نے محسوس کیا کہ معاملہ زیادہ سنگین ہے اور اس نے لارڈ ایلن بری کو ہنگامہ فرد کر لئے مامور کیا۔ انھوں نے مصر آکر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ تحریک کسی خاص جماعت سے متعلق نہیں ہے بلکہ

آبادی کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں اور طلبہ، وکلاء، اخبار نویس اور چھوٹے بڑے طبقہ کے تمام افراد شامل ہیں۔ چنانچہ اس نے ان حالات کے پیش نظر مصر کے لیڈروں کو بلا کر ان سے قیام امن و سکون ں کرنا مناسب سمجھا۔ اس مشورہ میں زاغلول پاشا کو بھی بلا کر شریک کیا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تشدد کی پالیسی کو تو مصر نے ملتوی کر دیا، لیکن اس کی جگہ اسٹرائیک، پکٹنگ وغیرہ شروع ۔ برطانیہ نے اب ایک کمیشن لارڈ ملنر کی سرکردگی میں مصر کے حالات کا مطالعہ کرنے کے لئے مامور کیا اور اسنے ٹ پیش کی اس سے برطانیہ کو معلوم ہوا کہ جب تک تولیت نہ اُٹھ جائے گی، مصریوں کو اطمینان نصیب ۔ لیکن تولیت کا اُٹھا لینا اور مصر کا آزاد و خود مختار ہونا دو جدا چیزیں تھیں۔ اور زاغلول کا مطالبہ زادی ہی کا تھا، اس لئے زاغلول کو پھر جلا وطن کر دیا گیا اور فروری ۲۲ء میں برطانیہ اور مصر کے ن ایک نیا معاہدہ ہوا جس کی رُو سے برطانیہ نے اپنی تولیت تو ختم کر دی، لیکن اور شرطیں ایسی لگا دیں کہ ے ہاتھ بدستور بندھے رہے۔ مثلاً ایک شرط یہ تھی کہ مصر میں غیر ملکیوں کے مفاد اور اقلیتوں کے تحفظ کا مسئلہ نیہ کے ہاتھ میں رہے گا، دوسرے یہ کہ مصر پہ بیرونی حملہ کی صورت میں برطانیہ مدافعت کرے گا، تیسرے سوڈان کا مسئلہ بالکل علٰحدہ متصور ہوگا۔ اور چوتھے یہ کہ برطانیہ کے ذرایع مواصلات جو مصر سے تعلق رکھتے ان کی حفاظت بھی برطانیہ ہی کرے گا۔

پھر کہنے کو تو یہ معاہدہ ہو گیا، لیکن مصر و برطانیہ کی نزاع اس سے ختم نہیں ہوئی، کیونکہ ان شرائط میں سے ں کی توضیح و صراحت مصر کو تسلیم نہ تھی۔ مثلاً لارڈ لائڈ کا کہنا یہ تھا کہ "برطانوی ذرایع مواصلات سے صرف سویز ہی مراد نہیں ہے بلکہ ہندوستان، آسٹریلیا، ایران، عراق اور چین تک پہونچنے والے خشکی، تری، ہوا کے تمام راستے اور ذرایع مواصلات اس میں شامل ہیں"۔

مصر اس کے تسلیم کرنے کے لئے طیار تھا کہ ان ذرایع مواصلات کی حفاظت برطانیہ کے لئے ضروری ہے ن وہ یہ ماننے کے لئے طیار نہ تھا کہ حفاظت کی یہ خدمت مصر سے چھین کر خود برطانیہ اپنے ہاتھ میں لے۔

سوڈان کے معاملہ میں بھی مصر، برطانیہ سے متفق نہ تھا، سوڈان بڑی وسیع سرزمین ہے اور دریائے کا منبع و مخرج ہے، اس لئے مصر کی آبپاشی بالکل سوڈان پر منحصر ہے۔ مصر کا کہنا یہ ہے کہ نہر سویز پر ار کے باب میں برطانیہ جو دلیل پیش کر سکتا ہے، وہی دلیل سوڈان کے باب میں مصر کی طرف سے پیش جا سکتی ہے کیونکہ مصر کی تمام اقتصادیات سوڈان پر منحصر ہیں۔ علاوہ اس کے مصریوں کی ایک دلیل یہی ی کہ مصر و سوڈان کی آبادی ایک ہی مذہب، ایک ہی زبان، ایک ہی کلچر رکھتی ہے اور محمد علی پاشا بانی لوم کے زمانہ میں مصر و سوڈان ایک ہی مملکت میں شامل تھے۔

اس کا جواب برطانیہ یہ دیتا ہے کہ سوڈان کو برطانیہ ہی نے مہدویوں سے چھینا تھا، پھر اس کے بعد ریلوں اور بندرگاہوں کی تکمیل و تعمیر اور روئی کی پیداوار بڑھانے میں برطانیہ نے بہت صرف کیا ہے اس لئے سوڈان پر ان کا بھی مصر کے برابر حق ہے۔

بہرحال مصر و برطانیہ کا یہ اختلاف سنہ ۲۲ء سے برابر چلا آرہا ہے اور آج تک اس کا فیصلہ نہیں ہوا۔ فواد کی تخت نشینی کے بعد جب مصر کی نئی کابینہ میں زاغلول پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے مامور ہوئے تو اکثریت اس کے ساتھ تھی اور اگر برطانیہ، زاغلول پاشا پر اعتماد کر کے اپنا نقطۂ نظر دوستانہ انداز میں اس کے سامنے پیش کرتا تو بہت ممکن ہے کہ مصر کا جھگڑا طے ہو جاتا، لیکن برطانیہ نے زاغلول کو ہمیشہ ایک باغی و انقلابی کی حیثیت سے دیکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مصر کی قومی تحریک نے زیادہ تشدد آمیز صورت اختیار کر لی اور قتل و خونریزی کے واقعات بھی پیش آنے لگے، یہاں تک کہ سنہ ۲۴ء میں سوڈان کا گورنر جنرل مار ڈالا گیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زاغلول کو استعفا دینے پر مجبور کیا گیا اور شاہ فواد نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی۔۔۔ جب سنہ ۲۶ء میں عام انتخاب ہوا تو زاغلول کی وفد پارٹی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔ لیکن برطانوی ہائی کمشنر نے پھر زاغلول کی مخالفت کی اور وہ کابینہ میں نہ آسکا۔ آخرکار سنہ ۲۷ء میں اس کا انتقال ہو گیا اور سارے مصر نے اس کا ماتم کیا۔

زاغلول کی وفات کے بعد مصطفےٰ نحاس نے وزارت قایم کی جو قوم پرست جماعت کے افراد پر مشتمل تھی اس لئے برطانیہ اور مصر کے تعلقات بدستور کشیدہ رہے۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں برطانیہ کی لیبر حکومت نے مصر سے نیا معاہدہ کیا جس کی رُو سے مصر کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے لے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ لڑائی کے زمانہ میں برطانیہ، مصر کی سرزمین پر اپنی فوجیں جمع کر سکے گا۔ برطانوی ہائی کمشنر کا عہدہ بھی منسوخ کر دیا گیا اور سوڈان کی بابت یہ کہا گیا کہ وہ دونوں حکومتوں کے زیر اثر رہے گا۔ لیکن نحاس کی وزارت نے ان شرایط کو رد کر دیا۔ اور شاہ فاروق نے برطانیہ کی تحریک پر وزارت توڑ دی اور عنانِ حکومت خود اپنے ہاتھ میں لیکر تمام اختیارات اسماعیل صدقی کو دیدئے جس نے سنہ ۱۹۳۰ء سے ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کیا۔ اکتوبر میں ایک نئے کانسٹی ٹیوشن کا اعلان کیا گیا جس کی رو سے بادشاہ کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ جب چاہے پارلیمنٹ کو توڑ کر سینٹ کے ۱۰۰ ممبروں میں سے ۶۰ ممبروں کو نامزد کر دے۔ انتخاب ممبران کے لئے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ پبلک ہر ۵۰ رائے دہندوں کے لئے ایک کا انتخاب کرے، لیکن وفد پارٹی کو کوئی موقع انتخاب میں شرکت کا نہیں دیا گیا، اسکے اخبارات

کو بند کر دیا گیا، اس کے لیڈروں کو قید میں ڈال دیا گیا اور انتخاب کے وقت سیکڑوں آدمی زخمی ہوئے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صدقی کو اکثریت حاصل ہو گئی۔

لڑائی کے بعد ۱۹۱۶ء اور ۱۹۲۰ء کے درمیان مصر نے بہت کمایا، روئی کی قیمت تقریباً ایک ہزار گنا بڑھ گئی اور دس سال تک مصریوں کے پاس اتنی دولت رہی کہ وہ سیاسی اصلاحات کے ہنگامہ کو قایم رکھ سکے، لیکن اس کے بعد جب کساد بازاری شروع ہوئی تو پھر یہاں ڈکٹیٹرشپ کا دور دورہ شروع ہو گیا۔

۱۹۳۴ء تک مصر کا سوال بدستور اپنی حالت پر رہا، نہ سویز پر اسے اقتدار حاصل ہوا نہ سوڈان پر۔ اور برطانوی اثرات میں کچھ کمی بھی ہوئی تو وہ ایسی نہ تھی کہ مصر اپنے آپ کو ایک خود مختار و آزاد حکومت کہہ سکے۔


ہندوستان اور پاکستان کی تمام
کتابوں کے لیے
یونیورسل بک ڈپو۔ محمد علی روڈ
بمبئی (۳)

کھانسی کو روکیے
اس سے آگے خطرہ ہے!

• کھانسی کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہ کیجیے یہی کھانسی اگر بڑھ جائے تو یہ خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہے۔ اس لئے کھانسی کے شروع ہوتے ہی اسے روکیے۔

سعالین

کی ایک ٹکیہ منہ میں رکھ کر آہستہ آہستہ چوسیے۔ یہ نہ صرف گلے کی خراش کو روکے گی، کھانسی کو دور کرے گی، طبیعت کو سکون بخشے گی بلکہ سانس کی نالیوں کو صاف کر کے نظام میں توازن پیدا کرے گی اور سانس کو خوشگوار بنائے گی۔
قیمت فی شیشی صرف بارہ آنے
ہمدرد دواخانہ وقف دہلی

# ایران کی بیداری

ایران، کبھی ترکی سلطنت کا حصّہ نہیں رہا۔ لیکن ترکی کی طرح دوسری ملحقہ اسلامی حکومتوں سے اسکے بھی تعلقات بہت وسیع رہے ہیں۔

بیسویں صدی کی ابتدا میں ایران، برطانیہ اور روس کی شاہنشاہیت کا شکار رہتا اور اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۰۷ء میں ایک معاہدہ کی رو سے اس کا جنوبی حصّہ برطانیہ کے زیر اثر آگیا اور شمالی حصّہ پر روس کا اقتدار قایم ہوگیا۔ جب ۱۹۱۷ء میں زاریت کا خاتمہ ہوا تو روس کی گرفت ڈھیلی پڑی اور برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ کرزن کو موقعہ مل گیا کہ ایران کو پوری طرح برطانیہ کے زیر اثر لے آئے، لارڈ کرزن کی اسکیم یہ تھی کہ خلیج فارس سے بحر کاسپین (اخضر) تک تمام حصّہ برطانیہ کے اقتدار میں لاکر اسے برطانوی ہند کا ایک سرحدی صوبہ قرار دیدے۔ چنانچہ جب ۱۹۱۸ء میں ترکوں کو شکست ہوئی تو برطانیہ نے ایران کے خاص، خاص اہم مقامات پر اپنی فوجیں متعین کردیں اور شاہ ایران کے لئے سوا اس کے کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ برطانیہ کے مطالبات کو تسلیم کرے۔ اس طرح ۱۹۱۹ء میں ایران سیاسی و فوجی حیثیت سے برطانیہ کے زیر اثر آگیا۔

**رضا شاہ**

لیکن یہ حالت عرصہ تک قایم نہیں رہی، کیونکہ ۱۹۲۰ء میں بالشیوکوں نے شمالی ایران کے صوبۂ گیلان پر حملہ کرکے اسے سوویٹ ریپبلک میں شامل کرلیا اور مازندران کے زرخیز میدانوں پر بھی دھاوا بول دیا اور ایرانیوں کو شکست ہوئی۔

انھیں ایرانی کاسکوں کی شکست خوردہ افسروں میں ایک نوجوان افسر ایسا بھی تھا جس کی پرورش مازندران کے ایک فارم میں ہوئی تھی اور جو اپنے ملک کی تباہی کو دیکھ دیکھ کر بہت متاثر ہورہا تھا۔ یہی گمنام فوجی افسر ۱۹۲۱ء میں تہران آیا اور صرف تین ہزار سپاہیوں کی مدد سے اس نے ایران کے تمام بڑے بڑے عمال کو گرفتار کرلیا اور شاہ ایران کو مجبور کیا کہ اسے سپہ سالار اور وزیر حربیہ مقرر کرے۔ اس نوجوان کا نام رضا خاں تھا۔ یہ ایران کی کاسک فوج میں جو زار کے فوجی افسروں کی نگرانی میں تھی، چند سال سے ملازم تھا۔

گو رضا خاں کو نہ پبلک کی اعانت حاصل تھی اور نہ وہ کوئی منظم جماعت رکھتا تھا، لیکن محض اپنی شخصیت اور جذبۂ قوم پرستی کی وجہ سے وہ کامیاب ہوگیا۔

اکتوبر ۱۹۲۳ء میں وہ ایران کا وزیر اعظم ہوگیا اور شاہ ایران سیاحت یوروپ کے لئے چلے گئے۔

ٹھیک یہی وہ وقت تھا جب مصطفےٰ کمال ترکی جمہوریت قایم کرکے اس کی عنان صدارت اپنے ہاتھ میں لیلی تھی۔ اس لئے رضا خاں نے بھی اس کے تتبع میں ایران کو جمہوریت میں تبدیل کرنا چاہا، لیکن یہاں کی مذہبی جماعت نے اس کی سخت مخالفت کی اور وہ مصطفےٰ کمال کے نقش قدم پر چل کر ایران میں وہ انقلاب پیدا نہ کرسکا جو ترکی میں رونما ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومتِ ایران نہ جمہوریت بن سکی اور نہ شاہنشاہیت رہی، کیونکہ شاہ ایران موجود نہ تھے۔ آخر کار ۱۹۲۵ء میں کانسٹی ٹیوٹنٹ اسمبلی نے رضا خاں کو بادشاہ بنا دیا اور اس نے شاہ رضا پہلوی کے نام سے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیلی۔

چار سال کے اندر رضا شاہ نے ایران کے لئے بہت کچھ کیا۔ امن وسکون کے قیام کے ساتھ ہی جاگیردارانہ نظام کو بھی کمزور کر دیا اور برطانوی فوجوں کو بھی جنوبی ایران سے ہٹ جانے پر مجبور کیا۔ یہاں تک شط العرب کے شیخ نے بھی جو برطانیہ کی حمایت میں ایران کے ایک ٹکڑے کا خود مختار فرمانروا بنا ہوا تھا، حکومتِ تہران کو تسلیم کرلیا۔

اس میں شک نہیں کہ ایران اب آزاد تھا۔ لیکن موجودہ زمانہ میں آزادی کا قیام مشکل ہے جب تک عہدِ حاضر کے ذرایع ترقی سے کام نہ لیا جائے۔ اس لئے رضا شاہ کے سامنے بڑا مشکل مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایران کو کس طرح مغربی اصول پر عمل کرکے ترقی کی راہ پر لگائے۔ وہ مغربی ماہرین کی خدمات حاصل کرنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ اپنے سیاسی اغراض سے خالی الذہن ہوکر آئیں گے نہیں اور خود ایران کے لوگوں میں یہ اہلیت نہ تھی کہ وہ از خود ترقی کی راہیں تلاش کریں، آخر کار مجبور ہوکر نظم ونسق سلطنت میں اسے مغربی ماہرین سے کام لینا ہی پڑا۔ مالیات کا شعبہ ایک امریکی ماہر ڈاکٹر ملسپاگ کے سپرد کیا، کسٹمس کے لئے بلجیم کے ماہرین سے مدد لی اور شعبۂ تعلیم میں فرانسیسی ماہرین سے۔ اس حد تک تو کوئی اندیشہ نہ تھا کیونکہ فرانس، بلجیم اور امریکہ کی سیاسی اغراض ایران سے وابستہ نہ تھیں۔ لیکن روس اور برطانیہ سے معاملہ کرنے میں اسے بڑا تردد تھا۔ ایک طرف ماوراء قاف اور ماوراء بحر اخضر کا علاقہ سوویٹ یونین میں شامل ہوگیا تھا اور بالشیوک کوشش کر رہے تھے کہ قاف سے خلیج فارس تک ذریعہ آمد ورفت قایم ہوجائے۔ دوسری طرف برطانیہ تھا جو اینگلو پرشین آیل کمپنی کا اجارہ دار تھا اور جس میں ۲۰ ہزار ایرانی ملازم تھے۔ راموز سے آبادان تک پائپ لائن ڈال لی تھی اور یہ کوشش ہو رہی تھی کہ بغداد سے تہران

تک ریل جاری ہو جائے اور ایرآن و ہندوستان کے درمیان ہوائی تعلق قایم ہو سکے۔

ایرآن کو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت تھی وہ ذرایع حمل ونقل تھے۔ سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے ایرآن کے ایک حصہ میں غلہ کی پیدا وار پڑی سڑا کرتی تھی اور قحط کی وجہ سے لوگ مرتے رہتے تھے، اسی کے ساتھ ایک دوسرا سوال یہ بھی تھا کہ اگر نقل و حمل کے لئے سڑکیں یا ہوائی راستے بنائے بھی جائیں تو ان پر بیرونی اقتدار نہ ہونا چاہئے۔ رضا شاہ نے بڑی ترکیب سے کام لیا اور وہ یہ کہ برطانیہ اور روس دونوں کو انھوں نے راضی رکھنے کی کوشش کی۔ بغداد سے طہرآن تک ریل جاری کرنے کی جو اسکیم برطانیہ نے بنائی تھی اس کو تو رضا شاہ نے منظور نہیں کیا لیکن اس کی جگہ سڑک بنانے اور قاہرہ سے کراچی تک ہوائی راستہ قایم کرنے کی اجازت دیدی اس شرط کے ساتھ کہ ہوائی اڈّے ایرآن کی ملکیت متصور ہوں گے، دوسری طرف روس کو اجازت دیدی کہ وہ ماسکو سے طہرآن تک ہوائی سروس قایم کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ یہ وعدہ کیا کہ ایرآن بحر کاسپین سے خلیج فارس تک ریلوے جاری کرے گا۔ اس لائن کا آخری اسٹیشن شمال کی طرف بحر کاسپین کے ساحل پر ایسی جگہ مقرر کیا گیا جو روس کے اقتدار سے باہر تھا اور جنوب کی طرف کا آخری اسٹیشن خلیج فارس کا ایک ایسا مقام تجویز کیا گیا جو برطانیہ کے اثر و اقتدار سے باہر تھا۔

رضا شاہ نے اس خطرناک کھیل کو بہت ہوشیاری سے کھیلا اور بغیر اپنی خود مختاری و آزادی کو صدمہ پہونچائے، روس اور برطانیہ کے صرف پر اس نے ایرآن کے لئے ذرایع حمل و نقل و مواصلات فراہم کر دئے۔

اقتصادی آزادی کا حصول البتہ زیادہ مشکل کام تھا، کیونکہ ایرآن باوجود اس کے کہ اس کی اقتصادی پوزیشن بُری نہیں ہے، وہ کفیل بالذات نہیں۔ کپڑا، شکر اور مشینری سب باہر سے آتی ہے۔ کپڑے کے تو خیر پانچ کارخانے رضا شاہ نے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں قایم کرائے۔ لیکن شکر اور مشینری کے متعلق وہ کچھ نہ کر سکے۔ ایرآن سے جو چیزیں باہر جاتی ہیں ان میں پٹرول، قالین پھل اور افیون خاص چیزیں ہیں، لیکن وہ پٹرول کے مارکیٹ کے لئے برطانیہ کا دست نگر ہے۔ اینگلو پرشین آیل کمپنی اسمیں شک نہیں ایرآن کے رایلٹی میں اتنی رقم ادا کرتی ہے کہ اس کا چوتھائی بجٹ اسی سے پورا ہوتا ہے، لیکن آمدنی کی یہ کوئی اطمینان بخش صورت نہیں ہے، علاوہ اس کے اہلِ ایرآن جب یہ دیکھتے ہیں کہ کمپنی اپنے مغربی حصہ داروں کو ۲۰ لاکھ پونڈ سے زیادہ ہر سال تقسیم کرتی ہے تو ان کو رشک آتا ہے کہ خود ان کے حصہ میں جو کچھ آتا ہے وہ کتنا کم ہے، حالانکہ زمین اور پٹرول در اصل سب انھیں کا ہے۔

قالین اور پھلوں کی برآمد میں ایران دوسرے ملکوں کے محکمۂ کروڑگیری اور خصوصیت کے ساتھ روس کے رحم وکرم کا محتاج ہے۔ افیون کی برآمد بین الاقوامی میلانات حایل ہوتے ہیں۔

مجلس اقوام نے ایران سے کہا کہ افیون کے بجائے وہ دوسری اشیا بھیجے، رضا شاہ نے جواب دیا کہ وہ پوست کی کاشت میں کمی کرنے کے لئے طیار ہے، بشرط آنکہ ایران کی دوسری پیداوار پر محصول کروڑگیری کم کردیا جائے، لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

رضا خاں نے بین الاقوامی مسایل میں بھی ایران کی خودداری قایم کرنے میں بڑا کام کیا۔ ۱۹۲۱ء سے پہلے شاہ ایران کی حکومت تہران کی چار دیواری کے اندر محدود تھی، لیکن رضا شاہ نے ہر صوبہ پر اقتدار قایم کرکے صحیح معنے میں اپنی حکومت قایم کرلی۔ رضا شاہ نے پارلیمنٹ بھی قایم کی، لیکن وہ ایسی ہی بیدست وپا تھی جیسے ترکی اور اطالیہ کی پارلیمنٹ۔ حکومت در اصل فوج کے بل پر کی جاتی تھی جو ستر ہزار تربیت یافتہ افراد پر مشتمل تھی۔ رضا شاہ نے جبریہ فوجی بھرتی کی تحریک شروع کی تو علماء نے اس سے اختلاف کیا لیکن جب رضا شاہ نے ان کو بہت عزت و احترام کے ساتھ ان کے لیڈروں کو پارلیمنٹ میں جگہ دیدی تو یہ مخالفت ختم ہوگئی۔

ایران کے بہترین سپاہی وہاں کے خانہ بدوش قبایل میں ملتے ہیں، لیکن رضا شاہ کے سامنے یہ مسئلہ بڑا مشکل تھا کہ وہ ان کی سپاہیانہ خو کو بھی قایم رکھے اور ان کی لوٹ مار کی عادت کو بھی ترک کرائے۔ اس نے یہ ترکیب اختیار کی کہ ایسے قبایل کے چند خاندانوں کو تو مویشی پالنے کے لئے مخصوص کردیا اور باقی خاندانوں کو کاشتکار بنانے کی کوشش کی اور انھیں زراعتی علاقوں میں آباد کیا۔ اسی کے ساتھ اس نے قبایلی علاقوں کے چاروں طرف کاشتکاروں کو مالکانہ حقوق دیکر بسا دیا اور ان کی کافی مدد کی۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد ترکی و ایران کے حالات میں بہت مماثلت نظر آتی ہے مثلاً یہ کہ دونوں جگہ تنہا ایک سپاہی نے قوم میں بیداری پیدا کی غیر ملکی رعایا کو جو مراعات حاصل تھیں وہ دونوں جگہ ختم ہوگئیں، نظم ونسق میں مغربی اصول دونوں جگہ اختیار کئے گئے، پھر بھی دونوں میں فرق پایا جاتا ہے۔ ترکی کا انقلاب ایک ایسی قوم کا انقلاب تھا جو اس سے قبل قوم کے مفہوم سے ناآشنا تھی، برخلاف اس کے ایران کا انقلاب بہت پرانی قوم کا انقلاب تھا جس میں مختلف جماعتیں شامل تھیں اور سب ملک کی آزادی و خودمختاری کے لئے کوشاں تھیں۔ مصطفےٰ کمال نے قدامت پسندی کے قیود کو بہت کے ساتھ دور کیا اور رضا شاہ کو اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ مصطفےٰ کمال نے ترکوں کا روایتی کلچر بدلنا چاہا اور رضا شاہ نے قدیم ایرانی کلچر کو بڑی حد تک بدستور قایم رکھا۔

---

# افغانستان

بیسویں صدی کی ابتدا میں تمام اسلامی ممالک میں مغربی تقلید اور قومیت کا احساس پیدا ہوگیا تھا لیکن اس میں ہر ملک کامیاب نہیں ہوا۔ اور انھیں ناکامیاب ممالک میں افغانستان بھی تھا۔

افغانستان عرصہ سے روس و برطانیہ کے درمیان ایک بفر (BUFFER) حکومت کی حیثیت رکھتا تھا اور اس طرح اسے کافی نقصان پہونچ رہا تھا۔ یعنی روس و برطانیہ دونوں یہ چاہتے تھے کہ وہ حد فاصل کی حیثیت سے قایم رہے لیکن اس کو پوری طرح آزاد بھی نہ دیکھ سکتے تھے۔ جب سنہ ۱۷ء میں انقلاب روس ہوا اور روس کی طرف کا خطرہ دور ہوگیا تو امان اللہ نے سوچا کہ اب برطانیہ کی مدد و حمایت کی ضرورت نہیں ہے اور اس بار سے بھی اس کے ملک کو آزاد ہونا چاہئے، اسی کے ساتھ چونکہ اس وقت برطانیہ، ترکی کا دشمن تھا اور مذہباً خلیفہ کا اثر افغانستان میں کافی تھا، اس لئے امان اللہ نے سنہ ۱۹ء میں ایک مہم درۂ خیبر پر برطانیہ کے خلاف روانہ کی، لیکن افغانی سپاہ جس کے پاس نہ ہوائی جہاز تھے، نہ مشین گنیں، برطانوی فوج کا مقابلہ نہ کر سکے اور آخر کار سنہ ۲۱ء میں افغانستان کو برطانیہ سے صلح کرنا پڑی۔ اسی کے ساتھ امان اللہ نے روس سے بھی معاہدہ کر لیا اور یہ سمجھ کر کہ اب وہ برطانیہ اور روس دونوں کے دست اندازی کی طرف سے مطمئن ہوگیا ہے، ایران اور ترکی کی تقلید میں مغربی قسم کی اصلاحات شروع کیں۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہوا کیونکہ اول تو وہ خود قومی لیڈر کی حیثیت نہ رکھتا تھا اور دوسرے یہ کہ مذہبی قدامت پرستی افغانستان میں بہت زیادہ تھی اور ملّاؤں کا اثر لوگوں پر بہت قوی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنہ ۲۴ء میں امان اللہ کے خلاف سارے ملک میں شورش پیدا ہوگئی اور سنہ ۲۹ء میں اسے معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد کئی سال تک اضطراب و ہیجان کا دور قایم رہا اور کوئی جم کر حکومت نہ کر سکا۔ آخر کار نادر شاہ نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور اس نے ۵، لاکھ پونڈ نقد، دس ہزار رائفلیں اور ۵۰ لاکھ کارتوس برطانیہ سے قرض لیکر حکومت کو سنبھالا لیکن نومبر سنہ ۳۳ء میں وہ قتل کر دیا گیا اور اس کا بیٹا ظاہر شاہ ۱۹ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا۔

# دی مغل لائن لمیٹڈ

سب سے پرانی ہندوستانی جہاز ران کمپنی

## بحر احمر اور ماریشس

کی بندر گاہوں کو مسافروں اور مال لے جانے والے جہازوں کا بیڑہ

---

## بمبئی سے

## عدن ، جدہ ، پورٹ سوڈان اور مصر

کی بندر گاہوں کے درمیان ہمارے جہازوں کی آمد و رفت
باقاعدگی اور خوش اسلوبی سے ہوتی ہے اور امید ہے کہ
ضرورت پڑنے پر دوسری بندر گاہوں کو بھی اپنے جہاز روانہ کر سکیں گے

مزید معلومات کے لئے
حسب ذیل پتہ پر لکھئے

## ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ

۱۶ - بنک اسٹریٹ - بمبئی

## منشی نولکشور کے وارث و جانشین

# راجہ رام کمار ہیں

مطبع منشی نولکشور کی تمام ان کتابوں کے لئے جو صرف نولکشور پریس ہی میں طبع ہوئی ہیں اور تمام فنون و علوم پر مشتمل ہیں، ذیل کے پتہ سے مکمل فہرست طلب فرمائیے۔ چند کتابوں کے نام یہ ہیں:-

**رُباعیاتِ انیس** - دل دادگانِ حضرت انیس کے لئے وہ مجموعہ ہے جو پہلے نہیں طبع ہوا، اُس کا مقدمہ سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے قیمت ۱۲

**جواہر لال** - انڈین یونین کے سب سے پہلے وزیر اعظم کے بچپن کے قصے نہایت دلچسپ اور مفید ہیں ہر شخص کو پڑھنا چاہئے۔ قیمت عہ

**ٹرکی** - کمال پاشا کے حالاتِ زندگی کا آئینہ ہے، جس سے یک قومی نظریہ سمجھ میں آتا ہے — قیمت ۱۲

**ہندوستان کے قدیم شہر** - ہندوستان کے قدیم شہروں کے مفصل حالات اس سے بہتر کہیں نہیں ملیں گے۔ قیمت عہ

**لغاتِ کشوری** - بہت مشہور و معروف اور مقبول لُغت ہے اس میں جس قدر اختصار وغیرہ کو مدنظر رکھا ہے وہ قابل دید و داد ہے طلباء کے لئے بہت مفید ہے - قیمت مجلد ۱۲ - بلا جلد صہ

**فرہنگِ شفق** - اُردو کے بے شمار محاورات کا مجموعہ اور چار مستند اُستادوں کے کلام سے اُن کی اسناد پیش کی گئی ہیں، شعراء اور زبان اُردو کے شائقین کے واسطے ایک نایاب تحفہ ہے، مصنفہ شفق کان پوری - قیمت پانچ روپیہ (صہ)

**دیوانِ ناسخ** - جدید الطبع ہو جو نہایت اچھے طور پر طبع ہوا ہو قیمت عہ

**کلیاتِ آتش** - جدید الطبع جو قدیم نسخوں سے مقابلہ کرکے نہایت اہتمام سے طبع کیا گیا ہے - قیمت ۱۲

**کلیاتِ میر** - قیمت ۱۲

**تاریخ حیدر آباد دکن** - یہ کتاب ہر طرح جامع ہے اور مصنف مولانا نجم الغنی مرحوم نے اپنی معلومات کا ذخیرہ پیش کر دیا ہے قیمت عہ

**معرکہ چکبست و شرر** - مولوی عبد الحلیم شرر اور منشی سجاد حسین اڈیٹر اودھ پنچ کی تمام و کمال بحث مع مثنوی گلزار نسیم اور غزلیات نسیم کے نہایت عمدہ کاغذ پر چھاپی گئی ہے - قیمت ۱۲

**مثنوی میر حسن** - یعنی بے نظیر اور بدر منیر کا نہایت مشہور و معروف قصہ - قیمت عہ

**تاریخ اودھ** - یہاں کے حکمراں سادات بارہہ کے عروج، خاندان بنگش، مرہٹوں کی شورش، نادر شاہ کے حملوں، روہیلوں، احمد شاہ ابدالی کی فتوحات وغیرہ کا عہد شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ بادشاہ آخری اودھ تک کے واقعات کا ایک مصفّیٰ اور مجلّیٰ آئینہ ہے از حکیم نجم الغنی - قیمت پانچ جلد کامل بارہ روپے (۱۲)

**فسانۂ آزاد** - دُنیائے ادب اُردو میں کون ایسا شخص ہے جو پنڈت رتن ناتھ کے نام سے ناواقف ہے جنکے چٹپٹے مضامین سوئیاں بنکر پڑھنے والوں کے دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ ظرافت اُنکے گھر کی لونڈی، فصاحت و بلاغت ان کا خاص حصہ ہے، ہر فقرہ چلتا جادو اور ہر جملہ ایک تیز خنجر ہے جو کسی پر اپنا کام کئے بغیر نہیں رہتا۔ چار جلدیں ہیں جن کی مجموعی قیمت ۱۸ - جلد اول للعہ - جلد دوم للعہ جلد سوم صہ - جلد چہارم صہ

**راجہ رام کمار پریس بکڈپو**